میرے لہو کی کہانی

(افسانے/ افسانچے/ منی کہانیاں)

نور شاہ

میرے لہو کی کہانی

افسانے/افسانچے/منی کہانیاں

نور شاہ

(۱۴ا۔لل دید کالونی، غوری پورہ لنک روڈ، راول پورہ، سرینگر 190005)
Cell: +91 8899637012
+91 9906771303

ISBN 978-81-19234-71-4

نام کتاب: میرے لہو کی کہانی

مصنف: نور شاہ

نوعیت: افسانے/افسانچے/منی کہانیاں

باراول: 2023

تعداد: 300

قیمت: تین سو روپیے

سرورق: نعیم یاد

زیرنگرانی: شبیر احمد

طباعت: میزان سروسز

زیراہتمام: نگینہ انٹرنیشنل کشمیر

ملنے کا پتہ: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس بمقابل فائر سروس
ہیڈکواٹر، بٹہ مالو سرینگر، 190007 (کشمیر)

(9419002212 / 7006773403)

انتساب

ان بیتے لمحوں کے نام جو ہم نے ساتھ گزارے اور اب اکثر
میرے ذہن پر دستک دیتے ہیں۔۔!

ترتیب

❁❁❁

حقیقت حال

ادب کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے اب انسانی زندگی کے افسانے، افسانچوں کی صورت اپنا رہے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان دنوں طویل افسانے لکھنے کا چراغ ٹمٹمار ہا ہے۔طویل کہانیاں بھی اب مختصر مختصر ہو کر منی کہانیوں میں پوشیدہ نظر آتی ہیں لیکن اس بات سے ہر گز ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طویل افسانوں یا طویل کہانیوں کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے، اپنی اہمیت اور افادیت ہے اور افسانوی ادب کے فروغ کے لئے ضرورت بھی۔افسانے یا کہانیاں ضبط تحریر میں لانے کے لئے جس عرق ریزی کا احساس ہوتا ہے افسانچے لکھتے وقت اس احساس میں کمی محسوس ہوتی ہے۔بہر حال بڑی بات کو مختصر انداز میں پیش کرنا ادبی ہنر مندی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔میں بھی کچھ عرصے سے افسانچے ضبط تحریر میں لانے میں مصروف ہوں۔میرے بہت سارے افسانچے بہت سارے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اور ہو بھی رہے ہیں۔کچھ افسانچے میرے شائع شدہ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔گزشتہ سردیوں کے دو تین مہینوں میں مجھے بہت سارے افسانچے لکھنے کے مواقع فراہم ہوئے، ان کو میرے لہو کی کہانی میں شامل کر کے آپ کی نذر کر رہا ہوں قبول کیجیے۔

سرینگر　　　　　　　　　　　　　　　　　　نور شاہ

۳۲ جولائی ۲۰۲۳ء

نثرِ نور

نور شاہ کو کشمیر میں اردو افسانے کا بابا آدم تسلیم کرنے میں کسی محقق کو تامل ہوسکتا ہے مگر اسے اس شاندار صنف کا ہابیل ماننے میں کسی کو ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ نور شاہ پچھلے ساٹھ سال سے پوری ریاست میں افسانے کا بانی کارنہ سہی تعمیر کار رہے ہیں۔ بقول ایلن ٹافلر اس زمانے کی دہائی کو پچھلے زمانوں کی صدی کے برابر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس عرصے میں کشمیر کی تواریخ، سماجی اور تہذیبی زندگی کی ساری فضائیں تبدیل ہی نہیں ہوئی بلکہ پورا انقلاب آگیا ہے اور اس انقلاب کے سارے نقوش نور شاہ کے متن میں عکس بند ہوگئے ہیں۔ انہوں نے خاصے طویل افسانے بھی لکھے ہیں اور مختصر افسانچے بھی لیکن وہ ہر رنگ میں اپنا امتیاز قائم و دائم رکھتے ہیں۔

اہل نظر اس بات کے قائل رہے ہیں کہ کسی قوم یا سماج کا باطن رسمی تواریخ کی صحافتی تحریروں میں نہیں بلکہ فنون کی آرسی میں اپنے پورے احساس نقوش کے ساتھ جلوہ گر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اتنی طویل مدت میں نور شاہ کے کچھ افسانوں میں تکرار کی کیفیت نظر آتی ہے لیکن وہ تو عظیم افسانہ نگاروں جیسے کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے یہاں بھی غیر حاضر نہیں ہے۔ نور شاہ کے فنی ادراک سے نئے لکھنے والوں کی لمبی قطار نے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ فیض حاصل کیا ہے۔

دیش بھر کے اردو رسالوں میں جن فکشن نگاروں نے کشمیر کا پرچم آن بان سے

لہرایا ہے ان میں نور شاہ پیش پیش ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آٹھویں دہے میں بھی اس کے قلم کی روشنائی ماند نہیں پڑی ہے۔ان کے قلم سے اب بھی افسانوں کا آبشار ہمارے اہربل کی طرح ست رنگی قوس قزح کی تزئین کرنے میں مصروف ہے۔

سرینگر

۴ جولائی ۲۰۲۳ء　　　　　　محمد یوسف ٹینگ

نورشاہ اور میں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ میرے پسندیدہ لکھنے والوں میں ابن صفی سرفہرست تھے۔ میں ان کے جاسوسی ناول ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ نسیم حجازی کی لکھی کہانیاں اور ان کے رومان میں ڈوبے قصے مجھے بہت متاثر کرتے تھے۔ رسالوں میں سب سے بڑا نام ماہنامہ ''بیسویں صدی'' تھا۔ خوشتر گرامی کا رسالہ ''بیسویں صدی'' دریا گنج دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ''بیسویں صدی'' میں کوئی تخلیق چھپنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ جن تخلیق کاروں کی تخلیقات ''بیسویں صدی'' میں چھپتی تھیں ان کو اردو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

''بیسویں صدی'' میں لکھنے والی اہم شخصیات میں نورشاہ بھی شامل تھے۔ ان کے افسانے رومانیت کی ترجمانی کرتے تھے اور ''بیسویں صدی'' رومانیت کا علم بردار تھا۔ نورشاہ اپنی چھوٹی عمر میں ہی ہمارے لئے ''لے جنڈ'' بن گئے تھے۔ ہم چھوٹے قلم کاران پر رشک کرتے تھے اور ساتھ ساتھ ایک کشمیری ہونے کے ناطے ان پر فخر بھی تھا۔

اسی زمانے میں، میں نے زندگی میں ایک اہم قدم اٹھایا۔ میں نے اکیس سال کی عمر میں مجلّہ ''نگینہ انٹرنیشل'' نکالا۔ میں اردو ادبی دنیا کی نامور شخصیات سے ناواقف تھا لیکن چند سالوں میں ''نگینہ انٹرنیشنل'' نے اردو ادب میں ایک مخصوص جگہ

بنائی۔

میں اکیس سال کی ہی عمر میں کشمیر یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ایم اے کے آخری سال کے اختتام پر طلباء یونیورسٹی کو الوداع کہہ رہے تھے،ان میں بشیر شاہ بھی تھے۔وہ نور شاہ کے چھوٹے بھائی تھے۔بشیر شاہ جب پہلی بار مجھے یونیورسٹی میں ملے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا:

''کیا آپ وحشی سعید ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے کہا:

''میں نور شاہ کا چھوٹا بھائی ہوں۔''

نور شاہ اپنی جوانی میں ہی اردو ادب کی ایک قد آور شخصیت بن گئے تھے۔ خوشتر گرامی نے جب ادبی دنیا سے رخصت لی تو انہوں نے ''بیسویں صدی'' کی ادارت رحمٰن نیر صاحب کے حوالے کر دی۔ہم جیسے ادب کے پرستاروں کے لئے یہ خوشی کی خبر تھی جب ہمیں معلوم ہوا کہ ''بیسویں صدی'' رحمٰن نیر صاحب کے محفوظ ہاتھوں میں آ گیا۔بیسویں صدی میں نور شاہ کا ایک خاص ادبی مقام تھا، رحمٰن نیر صاحب نے نور شاہ کا وہ ادبی مقام برقرار رکھا۔نور شاہ کے ساتھ میری ملاقات کئی دہائیوں کے بعد ہوئی۔ ہندوستان کے اردو ادب میں کشمیر کی اردو اکیڈمی نے ایک خاص مقام حاصل کیا تھا۔اس اکیڈمی نے اردو ادب کی ترقی اور بہبود کے لئے بہت بڑے کارنامے انجام دیئے۔اردو اکیڈمی کے بانی،روح رواں اور صدر نور شاہ تھے۔اسی اردو اکیڈمی کا ایک ادبی جلسہ ہوٹل شہنشاہ میں بھی منعقد ہوا۔تیس سال کے طویل عرصے کے بعد میں پہلی بار اس ادبی محفل میں شامل ہوا۔اسی ادبی جلسے میں

میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں نے مڑ کر دیکھا ایک معمر خوبصورت آدمی مخاطب ہوا:

''میں نور شاہ ہوں۔''

مجھے یقین نہیں آیا کہ میں نور شاہ سے ہمکلام ہو رہا ہوں۔ میں نے جذباتی انداز میں جواب دیا:

''مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔''

نور شاہ نے مجھے ایک کتاب ''کشمیر کے افسانہ نگار'' دیتے ہوئے کہا:

''اس کتاب میں آپ کا ذکر ہے اس کو ضرور پڑھئے گا۔''

میں نے جب اس کتاب میں اپنے اوپر لکھا ہوا مضمون پڑھا تو میں نے پہلی بار خود کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس مضمون نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس مضمون میں نور شاہ نے جو میرے بارے میں لکھا اس کا ذکر ان چند جملوں میں کرتا ہوں:

''وحشی سعید ایک بڑے افسانہ نگار تھے وہ کھو گئے اور اپنے کاروبار کے ہو کے رہ گئے۔''

میں بار بار نور شاہ کا یہ مضمون پڑھتا رہا اور پڑھنے کے بعد میں نے ارادہ باندھ لیا کہ مجھے اردو ادب میں واپس آنا ہوگا۔ اس کا ذکر اکثر و بیشتر میں نور شاہ سے کرتا رہا۔ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نور شاہ ادب کے میرے دوسرے پڑاؤ کے استاد ہیں۔

شاگرد کو اپنے استاد پر فخر ہوتا ہے اور کبھی کبھار رشک بھی۔ مجھے فخر اس بات کا ہے کہ نور شاہ کے قلم کی سیاہی خشک نہیں ہوئی اور رشک اس بات کا کہ وہ لگاتار خوبصورت کہانیاں تخلیق کر رہے ہیں۔ میری بات کا ثبوت میرے لہو کی کہانی میں

شامل کہانیاں اور افسانچے ہیں جن میں رومان بھی ہے اور معاشرے میں پھیل رہی برائیوں کا عکس بھی، نشے کی وبا ہو یا رشوت کی آفت نور شاہ نے خوبصورت انداز میں اپنی کہانیوں کے ذریعے ان مسائل کو اجاگر کیا ہے اور ادب کا چاشنی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ میرے لہو کی کہانی میں انہوں نے اپنا لہو صرف کیا ہے اور یہ رنگ ضرور لائے گا۔

وحشی سعید
سرینگر

دوا سے دعا تک

اسپتال جانے کا میرا مقصد اکرم کی ماں کی خیر و عافیت دریافت کرنا تھا۔ اکرم کے بارے میں بتا دوں کہ وہ ہمارا گھریلو نوکر ہے اور کئی برسوں سے ہمارے ہاں کام کرتے کرتے اب گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے اس کی ماں بیمار ہوگئی اور علاج و معالجہ کے لیے اکرم کو اسے اپنے گاؤں سے شہر لانا پڑا۔ شہر آتے ہی اس کی صحت اور بگڑ گئی جس کی وجہ سے اکرم کو اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ تب سے وہ ہمارے گھر نہ آسکا اور اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لئے اسپتال کے کسی خاموش گوشے کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ چند روز قبل امی بھی اس کی ماں کو دیکھنے کے لئے اسپتال گئی تھیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ اکرم کی ماں کی حالت تسلی بخش نہیں ہے، وہ شاید زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھیں لیکن امی کے چہرے کی اداسی اکرم کی ماں کی علالت کی عکاسی کر رہی تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ کچھ دن بعد میں نے بھی اکرم کی ماں کی خیر خبر جاننے کے لئے اسپتال کا رخ کیا۔ اسپتال کے بیرونی دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی مجھے کار پارکینگ کے نزدیک لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ کچھ لوگ جانے کیا دیکھنے کے لیے ایک دوسرے سے بازی لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں انہیں نظر انداز کر کے اسپتال کے اندر چلی گئی۔ اکرم کی ماں کا وارڈ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرانی ہوئی کہ ان ہی چند دنوں میں صحت یابی کی طرف بڑھ چکی تھی۔ بوڑھے چہرے پر رونق سی آگئی تھی، بجھی سی آنکھوں میں جینے کی روشنی آگئی تھی اور وہ اپنے

ناتواں ہاتھوں میں پیالہ تھامے چائے پی رہی تھی اور خوش بھی نظر آ رہی تھی۔اس کا حال جاننے کے بعد میں نے اکرم کے بارے میں پوچھا:

''جانے کہاں چلا گیا ہے۔ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا میرا حال پوچھنے کے بعد دوبارہ جانے کہاں چلا گیا۔۔!'' میں وارڈ سے باہر آئی اور کار پارکینگ کا راز جاننے کے لئے بھیڑ کے ذرا قریب گئی۔اس بھیڑ میں مجھے اکرم بھی نظر آیا۔وہ مجھے دیکھتے ہی بھیڑ سے باہر آیا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔''میں تمہاری ماں کو دیکھنے آئی تھی۔پہلے سے بہتر نظر آ رہی ہے۔اسے اب گاؤں کب لے جا رہے ہو۔۔؟''

''بڑی دیدی جب اسپتال والے اجازت دیں گے لیکن۔۔۔!''

''لیکن کیا۔۔۔؟''

''جس کی دعاؤں سے میری ماں اتنی جلدی صحت یابی ہوگئی وہ اب ہمارے درمیان نہ رہی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بات کر رہے ہو؟''

''دوا نے تو میری ماں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ڈاکٹر قریب قریب جواب دے چکے تھے لیکن مالاماں کی دعا نے اسے صحت دی،زندگی دی۔''

''کون مالاماں۔۔۔؟''

''مالاماں نے اس اسپتال کے ایک پرانے اور بوسیدہ گیراج کے ایک گوشے کو اپنا گھر بنالیا تھا۔سنا ہے کافی دنوں سے وہ یہاں رہ رہی تھی۔صبح سے رات گئے تک بیماروں کے لئے دعا مانگنا اس نے اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کوئی نہیں جانتا۔شاید کوئی جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔سب اس کی دعاؤں کے متمنی تھے لیکن اب وہ یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔اسی وجہ سے یہاں اتنی بھیڑ جمع ہو چکی ہے۔میں سوچتا ہوں بڑی دیدی۔۔۔۔۔۔!''

''کیا سوچتے ہو اکرم۔۔۔۔!''

''اس اسپتال میں دوا تو ملے گی لیکن دعا۔۔۔۔!''

میں نے اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔دیکھتی ہی رہی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

جرمن کوئین

ڈیجیٹل مارکیٹنگ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد احمد فواد کا یونیورسٹی کی وساطت سے جرمنی جانا اور ایک بین الاقوامی سطح کے انٹرویو میں شامل ہونا اس کی خوش نصیبی کا ذریعہ بن گیا۔ اپنی بہتر کارکردگی کی بنا پر عالمی سطح کی ایک ڈیجیٹل کمپنی نے اسے مارکیٹنگ شعبہ کا انچارج بنا دیا۔ اس شعبہ میں اس نے دو سال بڑی جانفشانی کے ساتھ کام کیا اور پھر کمپنی کے مشاورتی بورڈ کے ایک اہم رکن کے طور پر اس کی تعیناتی ہوئی۔ کمپنی کے مختلف شعبہ جات کی کارکردگی میں بہتری لانے کے لئے اس کی تجاویز افادیت اور اہمیت اختیار کرتی گئیں لیکن اس پر وقار ماحول میں رہتے ہوئے بھی اگر اسے کسی چیز کی کمی کا احساس رہتا۔ اس کا تعلق مشرقی طرز زندگی، ہندوستانی تہذیب وتمدن اور کلچر سے تھا۔ اس ماحول میں اردو اور اردو زبان وادب سے اس کی وابستگی اس کی محبت، اس کے ذہن اور اس کی سوچوں کی تہہ میں پوشیدہ ہوتی گئیں۔ اردو زبان میں تحریر کردہ کتابیں وہ اکثر گھر سے منگواتا تھا لیکن اب انہیں پڑھنے کے لئے اس کو وقت میسر نہ تھا۔ یہ کتابیں اپنی ورق گردانی کے لئے بے قرار نظر آتی تھیں۔ اپنی بہت زیادہ مصروفیات کے باوجود اپنے گھر کو مشرقی انداز میں دیکھنے کی تمنا اب بھی جاگتی رہتی تھی اور جب اس کی شادی کی بات چلی تو اس نے اپنے خاندان کی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے کی رضامندی دے دی۔ والدین کی مرضی سے لڑکی کا انتخاب ہوا۔ خانم پڑھی لکھی اور دیندار تھی۔ شرافت، نفاست، سادگی اور خوبصورتی کی پیکر تھی۔ احمد فواد بندر وزنوں کے لئے اپنے ملک، اپنے شہر اور اپنے گھر

چلا آیا۔ نکاح کی تقریب سادگی سے انجام دی گئی۔ دو دن سسرال میں اور باقی چند دن اپنے گھر میں گزارنے کے بعد وہ خانم کو ساتھ لے کر جرمنی لوٹ آیا۔ خانم کے آتے ہی اس کے گھر میں ایسی تبدیلی دیکھنے جو ملی جس کا احساس جانے کب سے احمد فواد کے ذہن میں پنپ رہا تھا اور جانے کب سے باہر آنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ کتابوں کی ورق گردانی شروع ہوئی، گفتگو اردو زبان میں ہونے لگی اور اردو زبان وادب کی آبیاری ہونے لگی۔ اردو شاعری کی مہک بکھرنے لگی۔ گھر کی ہر شئے پر مشرقیت اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ کھانے پینے میں مشرقی طریقہ انداز اپنانے سے سلیقہ مندی نے گھر کی رونق بڑھا دی۔ اب وہ ایک ہندوستانی گھر لگ رہا تھا ہر انداز اور ہر ادا سے۔ اور پھر آہستہ آہستہ رک رک اور ٹھہر ٹھہر کر زندگی کی راتیں دنوں میں بدلتی گئیں اور دن راتوں کا روپ ورنگ اپناتے گئے۔ اب احمد فواد مشاورتی بورڈ کا سربراہ بن چکا تھا اور اس وجہ سے اسے اپنے گھر، اپنے دفتر اور اپنے شہر سے باہر جانا پڑ رہا تھا کیونکہ کمپنی کی سرگرمیاں بہت حد تک بڑھ چکی تھیں۔ احمد فواد کی ذمہ داریاں بھی بڑھ چکی تھیں اور مصروفیات بھی۔ اس وجہ سے خانم کی جان پہچان اور دوستی کا حلقہ بھی بڑھ رہا تھا۔

اب کی بار اسے دو ماہ گھر سے باہر رہنا پڑا۔ مختلف مغربی ممالک کا سفر کرنا پڑا اور جب دو ماہ بعد اس نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھے اور دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھلتے ہی وہ حیران وششدر رہ گیا۔ دو قدم اندر چل کر اس کی حیرانگی میں اور اضافہ ہوا۔ گھر میں نہ مشرقی ماحول نظر آ رہا تھا اور نہ مشرقی طرز زندگی کی کوئی جھلکی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ سب کچھ بدل چکا تھا، مشرق مغرب کا راستہ اپنا چکا تھا۔
خانم مغربی لباس میں ''جرمن کوئین'' جیسی لگ رہی تھی۔۔۔!

اپنا اپنا درد

صحت ناساز ہونے کی وجہ سے سلطان احمد کا اپنے گھر سے باہر آنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ اپنے عزیز دوست محمد اکرم کی بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ محمد اکرم کو بھی شادی کی تقریب کے دوران اپنے دوست کی کمی لمحہ لمحہ ستاتی رہی۔

شادی کی تقریب کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد بیٹی اپنے باپ کو اکیلے تنہا چھوڑ کر میکے چلی گئی۔ ویسے بھی محمد اکرم شادی کی تقریب سے چند روز قبل اپنی ساری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ قانونی طور اپنی بیٹی کے نام کر گئے تھے اور اب وہ اس تعلق سے مطمئن تھے۔

چند ماہ بعد جب سلطان احمد کی صحت قدرے بہتر ہوئی اور گھر سے باہر جانے کی ڈاکٹر نے اجازت دی تو انھوں نے پہلی فرصت میں اپنے دوست سے ملنے کے ارادے کو عملی صورت دے دی۔

مدتوں بعد دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ دونوں نے اپنی اپنی زندگی کی کتاب کے وہ اوراق ایک دوسرے کے سامنے کھول دیئے جن سے اتنا قریب رہنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔

"یار اکرم ایک اندر والی بات جاننا چاہتا ہوں۔"

"اندر والی بات سے تمہارا مطلب کیا ہے سلطان ۔۔۔۔ میرا اندر باہر تو ایک ہی ہے اور تم میری ہر بات، میری زندگی کے ہر گوشے سے واقف ہو۔۔۔ پھر کیا اور کیوں جاننا چاہتے ہو۔"

''میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم نے شادی نہیں کی پھر بھی ایک بیٹی کے باپ ہو۔ سلیقہ کے باپ۔۔۔ یہ تمہاری عظمت ہے کہ تم نے کبھی سلیقہ کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کہ ماں نہیں ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔ میرے دوست یہ تو سچ ہے۔''

''تو پھر سلیقہ کی ماں کون ہے۔؟۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔؟ معاف کرنا وہ تمہاری ناجائز اولاد۔۔۔۔۔''

''نہیں۔۔۔۔۔ ایسا مت کہو۔''

''تو پھر مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سلیقہ کی ماں کون ہے میں نہیں جانتا۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں لیکن سلیقہ میری بیٹی ہے۔۔۔ وہ اکرم کی بیٹی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر خواہش، ہر تمنا اس پر نچھاور کردی۔ یہاں تک کہ میں نے اسے سوتیلی ماں سے دور رکھنے کے لئے شادی تک نہیں کی۔ اسے اچھی تعلیم سے آراستہ کیا اور میں خوش ہوں، خوش نصیب بھی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔''

''لیکن سلیقہ کون ہے کیسے آئی تمہاری زندگی میں۔ یہ تم بخوبی جانتے ہو اکرم''۔

''میں آج پہلی بار اپنے دل کی کہانی سنا رہا ہوں۔ ذہن کے دروازے کھول رہا ہوں۔ وہ شاید اس لیے کہ تم میرے دوست ہو، عزیز دوست۔۔۔۔۔!''

''کیا ہوا تھا۔۔۔؟ کہانی کیا ہے۔؟''

''سلطان احمد۔۔۔ یہ قریب قریب پچیس برس قبل کی بات ہے میں جوان تھا صحت مند تھا، کچھ کرنے کا جنون میرے اندر تھا۔۔۔ کرافٹ انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد مجھے فوراً ہی نوکری مل گئی اور میں اسی ملازمت کے سلسلے میں اپنے شہر سے دوسرے شہر چلا آیا۔''

''دوسرا۔۔۔۔۔کون سا شہر۔''

''جہاں میں اب بھی رہتا ہوں اور کبھی میں اور تم رہتے تھے اپنی ملازمت کے دوران۔۔۔۔جہاں تم مجھ سے ملنے بھی آتے تھے اور آج بھی آئے ہو۔ میں تو اسی شہر کی بات کر رہا ہوں۔''

اور پھر۔۔۔؟

''دن بھر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے میں نے شام کے وقت جھیل کے کنارے چہل قدمی شروع کی۔ جھیل سے ابھرنے والی ٹھنڈی ہواؤں، درختوں کے آس پاس بکھری فضاؤں اور دور ونزدیک پھیلے ہوئے رنگ رنگ کے پھولوں کی خوشبو سے اپنے ذہن کو معطر کرنا میری زندگی کی اہم کڑی بن گئی۔ ایک شام۔۔۔۔شاید شام اتر چکی تھی میں نے جھیل کے سامنے کی سڑک پر ایک تیز رفتار کار کو بہت دور سے بریک لگنے کی ڈراؤنی آواز کے ساتھ رکتے ہوئے دیکھا۔ ایک شخص جلدی میں کار سے باہر آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سفید بیگ تھا۔ اس نے وہ بیگ چنار کے درخت کے قریب رکھا اور کار میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گیا۔ میں تیز تیز قدموں سے چنار کے درخت کے قریب آیا، میں گھبرا گیا بیحد گھبرا گیا۔ بیگ کے اندر سے معصوم چیخوں کی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے بیگ کو اٹھا لیا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ بیگ کے اندر ایک ننھی منی بچی ہے جسے مرنے کے لیے یہاں چھوڑ دیا گیا تھا لیکن مسرت بھی ہوئی کہ بچی زندہ ہے۔''

''اور پھر کیا ہوا۔۔؟ سلطان احمد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔'' ''اور کیا ہونا تھا میں بچی کو اپنے گھر لے آیا۔ سلیقہ میری بچی ہے میری بیٹی ہے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔ اپنے ہونٹ سی لیے۔ کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔کیا ضرورت تھی اس کی سلطان۔۔۔۔سلیقہ میری زندگی کا

اثاثہ بن گئی۔۔۔مجھے بیٹی ملی اور سلیقہ کو باپ۔۔۔"

اور اس کے ساتھ ہی سلطان احمد کے ہاتھ تھرتھرائے۔آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہنے لگی۔۔۔وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔۔۔۔

"کیا ہوا سلطان بھائی۔۔۔۔رو کیوں رہے ہو۔۔؟"۔

"مجھے رونے دو اکرم میرے یار"۔

"کیوں رونے دوں۔۔۔۔میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے،خوشیاں بانٹنے کے بجائے تم آنسو بہا رہے ہو۔۔۔۔رو رہے ہو۔۔۔۔کیوں؟۔۔۔کس لیے۔۔؟

"اکرم۔۔۔۔وہ بیگ۔۔۔۔وہ سفید بیگ میں نے رکھا تھا وہاں۔۔۔۔ سلیقہ کا باپ میں ہوں۔۔۔۔۔میں۔۔۔"

اس کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔۔۔ایک طویل خاموشی۔۔۔۔شاید دونوں اپنا اپنا درد بانٹ رہے تھے۔۔۔۔

آواز کا جادو

کالج میں اپنی تعلیم کے دوران وہ اپنی گرج دار آواز کی بدولت کافی ہردلعزیز بن چکا تھا۔کالج میں جب کبھی بھی پیش پردہ کا پس پردہ اس کی آواز کی ضرورت پڑتی وہ ہنستے مسکراتے مائک سنبھالتا اور ماحول کو اپنی گرج دار آواز کے جادو سے پر کیف اور پرسوز بنا دیتا لیکن جب کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا اور اپنے لئے روزگار تلاش کرنے لگا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی اور پریشانی بھی۔اس کی گھریلو ذمہ داریاں کافی بڑھ چکی تھیں اور بے روزگاری کی وجہ سے حوصلے پست ہوتے جارہے تھے۔اس بے روزگاری کے دوران ایک بار پھر اس کی آواز نے اس کی مدد کی۔ایک نئی سیاسی تنظیم نے جلسے جلوسوں میں اپنے حق میں نعرے بلند کرنے کے لئے اس کی خدمات حاصل کیں اور یہ کام انجام دینے کے لئے اسے بھی خاصی رقم ملنے لگی۔

تیسرا دروازہ

کبھی یہ گھرانا بستی کے معزز گھرانوں میں شامل ہوتا تھا۔اس گھرانے کے مرد و خواتین شرافت اور صداقت کے پیکر ہوا کرتے تھے لیکن اب والد محترم ایک کمرے میں اور ان کے فرزند ارجمند دوسرے کمرے میں تنہا تنہا ایک دوسرے سے بے خبر دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں کو منشیات کی لت پڑ گئی ہے۔

اور گھر کی مالکن۔۔۔۔والد محترم کی شریک حیات اور فرزند ارجمند کی شفیق ماں اسی گھر میں، اسی چار دیواری کے اندر سوئی گھر میں خالی خالی برتنوں کے درمیان اپنی قسمت کو کوستی ہوئی گھر کے تیسرے کمرے کی جانب دیکھے جا رہی ہے جو خالی ہے اور جس کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔۔۔!

دوسری بیوی

یوں تو غلام الدین گلکار تعمیراتی کمپنی کا ایک ملازم تھا لیکن اس کی شخصیت کے کئی پہلو تھے، کچھ خوبصورت اور کچھ بدصورت، کچھ رنگ دار اور کچھ بے رنگ، جہاں بدصورت اور بے رنگ شخصیت کی پہچان اس کی رشوت خوری میں صاف صاف نظر آتی تھی وہی اس کی خوبصورت اور رنگ دار شخصیت میں اس کے لہجے کی نرمی اور آنکھوں میں شرافت کی روشنی سے انکار ممکن نہ تھا۔ ہاں ایک اور بھی دلچسپ یا غیر دلچسپ واقعہ اس کی زندگی کا حصہ تھا۔ وہ اپنے گھر کو خوش حال رکھنے میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بیوی خوش تھی اور گھر کا ماحول بھی دل پسند تھا۔ آمدنی خوب تھی اس لئے گھر میں کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی لیکن دوسری بیوی کون ہے؟ کیسی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس کی جانکاری صرف اور صرف غلام الدین کو تھی۔

شاید یہ اس کی خوش بختی تھی یا بدبختی کہ کمپنی کا چیف غلام الدین پر مہربان تھا اور اس وجہ سے رشوت خوری کا داغ اس کے لہجے کی نرمی میں چھپ گیا تھا۔ رشوت کے روک تھام کے بجائے چیف صاحب اس کے مشوروں کو قبول کرتا تھا اور اس وجہ سے کمپنی کے دوسرے ملازم حیران ہو رہے تھے اور پریشان بھی۔ کبھی کبھار وہ سوچنے لگتے کہ چیف صاحب بھی رشوت کی مٹھاس سے اپنا ذائقہ تو نہیں بدل رہے ہیں۔

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ کمپنی کے چیف صاحب کے کنٹریٹ کی معیاد پوری ہوگئی اور کمپنی سے باہر ہوگئے۔ نئے چیف نے اقتداری کرسی سنبھالی، کوئی نیا پروگرام ہاتھ میں لینے سے پہلے پرانے پروگراموں کی عمل آوری اور موجودہ صورت

حال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینے سے رشوت ستانی کے کئی ان دیکھے معاملے کمپنی کی فائلوں سے نکل کر باہر آئے۔ یہ دیکھ کر کمپنی کے دوسرے ملازم شادماں نظر آنے لگے۔

تحقیقات کے دوران غلام الدین کو لاتعداد بار چیف صاحب کے کمرے میں بلایا گیا اور اسی طرح رشوت ستانی کے معاملات اور دیگر انتظامی اور مالی امور کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد نئی صورت حال سامنے آگئی اور قانونی کاروائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

چند روز بن برسے ہی گذر گئے۔

شام اتر چکی تھی۔

نئے چیف صاحب اپنی کار خود ڈرائیو کر رہے تھے اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر غلام الدین نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ کے اشاروں سے چیف صاحب کار کو کبھی دائیں تو کبھی بائیں جانب لے کر آگے بڑھا رہے تھے اور پھر ایک گلی کے سامنے رک گئی۔۔۔ دونوں کار سے باہر آئے اور چند قدم چل کر دو منزلہ مکان کے اندر آکر ایک سجے سجاتے کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرہ دیکھ کر چیف صاحب خوابوں کی دنیا میں کھو گئے۔ پھر انہیں لگا کہ دھواں دھواں سا سایہ اندر آرہا ہے نہ کوئی آہٹ ہوئی اور نہ ہی دستک کی آواز سنائی دی۔

پھر ہوا کا ایک ان دیکھا جھونکا کمرے کو معطر کر گیا۔

’’آپ کی پسند کیا ہے۔۔۔ چیف صاحب‘‘

غلام الدین آہستہ آہستہ قدموں سے کمرے سے باہر آئے۔

اور اب خواب گاہ کی طرح سجے سجانے کمرے میں نئے چیف صاحب تھے اور غلام الدین کی دوسری بیوی۔۔۔۔۔۔

رشتے

بارشیں تھم چکی تھیں اور اب دھوپ کی سنہری کرنیں موسم میں میٹھا میٹھا سا نکھار لانے کے لئے بے تاب ہو رہی تھیں۔ میں قلم اور رائیٹنگ پیڈ ہاتھوں میں لے کر کمرے سے باغیچے میں چلا آیا۔ باغیچے میں ایک خوشگوار اور خوش کن تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں لکھنے کے لئے ابھی من بنا ہی رہا تھا کہ میری بیوی بے آواز قدموں سے آئی اور ایک لمبی سانس لے کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد ہماری بہو بھی اپنے ہاتھوں میں ایک موٹی سی کتاب تھامے ہم سے ذرا دور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگی۔

خاموشی باغیچے کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی کہ دفعتاً ایک چڑیا جانے کہاں سے اڑتی اڑتی آئی اور سرسبز گھاس پر گھومنے پھرنے لگی۔ شاید کھانے کے لئے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ میں اس کے حرکات وسکنات دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک اور چڑیا نمودار ہوئی۔ وہ بھی گھومنے پھرنے لگی، گھاس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ شاید وہ بھوکی تھی۔ اچانک دونوں قریب آ کر ایک دوسرے کے پر نوچنے لگیں۔

"ان کو کیا ہو گیا۔؟"...... میری بیوی نے جاننا چاہا۔

"بابا ان کو بھگا دیجیے"۔۔۔۔۔ بہو نے کہا۔

"ضرور ان کا کوئی رشتہ ہو گا تب ہی تو ایک دوسرے کے پر نوچ رہی ہیں۔"

"رشتہ۔۔۔ کیسا رشتہ۔۔۔" میری بیوی اور میری بہو کی آواز ایک ساتھ سنائی دی۔

"ساس بہو کا رشتہ ہو سکتا ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

اور چڑیوں کو وہاں سے بھگا دیا۔۔۔۔!

دستک ہوئی پہچانی سی

میں جبل پور ایک سمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ سمینار سے فارغ ہونے کے بعد اچانک میرے ذہن میں دیپک کشمیری کی صورت ابھر آئی۔ کشمیر سے جانے کے بعد وہ جبل پور میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ ذہن میں بہت ساری یادیں گردش کرنے لگیں۔ ان کے ساتھ بیتے ہوئے ان گنت لمحے آنکھوں میں مسکرانے لگے۔ یونیورسٹی کے سنٹرل کونٹر کی وساطت سے دیپک کے بارے میں تھوڑی سی جانکاری ملی اور میں بتائے ہوئے راستے کو اپناتے ہوئے ان سے ملنے چلا گیا۔

مجھے دیپک کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔

میں نے کال بل کا بٹن دبایا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت نے دروازہ کھولا۔

"کون ہیں آپ؟"

"ایک کشمیری پنڈت"۔

"کن سے ملنا ہے"

"ایک کشمیری مسلمان سے"

"کشمیری مسلمان سے کیا مطلب۔۔۔آپ کس کشمیری مسلمان سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہاں تو۔۔۔۔ہم تو۔۔۔۔!"

"جانتا ہوں۔۔۔لیکن آپ نہ جانے کیوں یہ کشمیر سے ایک کشمیری

پنڈت ایک کشمیری مسلمان سے ملنے آیا ہے۔"

"آپ کشمیر سے آئے ہیں۔۔۔اندر آیئے نا۔۔"

"نہیں بھابھی جی۔۔۔۔پہلے میری بات ان تک پہنچا دیجیے۔"

"آپ نے مجھے پہچان لیا لیکن میں۔۔۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اندر گئی اور اندر سے دیپک کشمیری باہر آیا۔اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔مجھے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔

"مجھے پہچان رہے ہونا دیپک۔۔۔۔میرے کشمیری مسلمان دوست۔"

" ہاں ہاں پہچان چکا ہوں۔۔۔صادق علی۔۔۔میرے کشمیری پنڈت دوست"۔

تیس برسوں کے طویل عرصے کے بعد بھی کشمیر کا بھائی چارہ کشمیر سے دور۔۔۔۔۔بہت دور اپنی تاریخ کے اوراق تلاش کر چکا تھا۔۔۔۔

تصویر کی کہانی

روز صبح سویرے پینٹنگ روم کا دروازہ کھل جاتا اور کینواس کے ٹھیک دائیں جانب تپائی پر سجے سنورے رنگ رنگ کے ان گنت برش اپنی تازگی لئے سامنے پڑے رنگوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے اور یہی احساس مصور کے ذہن کے گوشوں میں نت نئی تصویروں کے خدوخال ابھارنے اور سنوارنے میں مدد کرتے۔ روز نئی ایک تصویر بنتی اور شام گئے یہی تصویر پہلے کالے سیاہ اور پھر سپید رنگوں میں ڈوب جاتی اور کینواس سے غائب ہو جاتی۔ دراصل وہ ایک ایسی تصویر بنانا چاہتا تھا، ایک ایسی عورت کے خدوخال ابھارنا چاہتا تھا جو روایت سے بغاوت کرنے پر تلی ہوئی دکھائی دے۔ وہ اسی بغاوت کو عورت کا روپ دے کر تصویروں اور پینٹنگ کی دنیا میں ایک نیا تصور پیش کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ٹھیک اسی وقت جب وہ اپنی تصویر کے لئے اپنے رنگوں اور برش سے کھیلنے میں مصروف ہوتا تو اس کی اپنی بیوی روایت سے بغاوت کر کے اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے ملنے کے لئے اس کے گھر جاتی تھی۔

درددل

ڈاکٹر صمد امراض قلب کے ایک نامور ڈاکٹر تھے۔ان کی شخصیت لہجے کی شیرینی ،آنکھوں کی شرافت اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے مالا مال تھی۔مریض کی بات سننا، اپنی بات سنانا اور لبھانا ایک اور خوبی تھی۔وادی گلپوس کے ایک بڑے سرکاری اسپتال کے انچارج کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے پھولوں کی وادی کو الوداع کہا اور اپنے بچوں کے پاس قطر چلے گئے۔دوسال کی مدت کچھ اس طرح سے وادی گلپوش کی فضاؤں میں تحلیل ہوئی کہ احساس تک نہ ہوا۔جب دوسال بعد وہ آئے تو ان کی آمد کی خبر اخباروں کی زینت بنی۔ایک اخباری انٹرویو کے دوران انہوں نے کہا۔۔

''دوسال کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہوتی لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ اپنی وادی گلپوش کے امراض قلب کے مریضوں کا سارا درد میرے سینے میں اُمڈ آیا تو میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔اب میں اپنے مریضوں میں لوٹ آیا ہوں۔ان کا اور اپنا درددل بانٹنے کے لئے۔۔۔''

نرخ نامہ

نمازِ عید سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اس نے گھر گھر جانا شروع کیا اور قریب قریب ہر گھر سے قربانی کے گوشت کے چھوٹے بڑے ٹکڑے حاصل کرتی رہی۔ شام کو جب اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو گوشت کا وزن کئی کلو ہو چکا تھا۔ گھر میں جو بنا تھا کھالیا اور سو گئی۔ دوسری صبح یہ گوشت لے کر قصائی کی دوکان پر گئی اور سرکاری نرخ کے مطابق گوشت کی قیمت وصول کی اور پھر یہی گوشت قصائی نے بازاری نرخ پر ضرورت مندوں کو فروخت کیا۔

کاروبار

یوں تو پوری بستی میں بادامی میڈیکل شاپ اپنی نیک نامی کے لئے جانا جاتا تھا۔اس کا مالک خالق خان بھی نیک سیرت تھالیکن خالق خان کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شکیل خان نے یہ کاروبار سنبھالا۔اس نے مختلف زاویئے اپنا کر اس کاروبار کو وسعت دینے کے لئے راہیں ہموار کرلیں۔خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ہر سمے بھیڑ لگی رہتی، خاص طور سے نوجوانوں کی بھیڑ۔۔۔!

پولیس کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ شکیل خان دوائیوں کی صورت میں منشیات کو اپنے کاروبار کا ایک حصہ بنا چکا ہے۔

ماں

انسانی زندگی کی کہانیاں بدلتی رہتی ہیں۔

والد محترم کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنا آبائی گھر فروخت کیا اور اپنے لئے الگ الگ گھر بسانے کی تجویز کو عملی صورت دینے کا فیصلہ کرلیا لیکن ماں کس بیٹے کے ساتھ رہے گی یہ فیصلہ نہ ہوسکا۔ مکاں فروخت کرنے کا فیصلہ لیتے ہی بڑی بہو اور چھوٹی بہو کے درمیان وقت بے وقت کی تلخ کلامی مٹھاس اپنانے لگی۔ ایک دوسرے کو کوسنا بند ہو گیا، دونوں ایک ہی زبان بولنے لگیں اور دوریاں نزدیکیوں میں بدلنے لگیں۔

والد محترم کی محکمہ تعلیم سے بحثیت ایک استاد وابستگی رہی تھی اور معتبر اساتذہ میں ان کا نام شامل تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران انہیں دو تین اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسکول کے کمزور بچوں کو چھٹی کے دن اپنے گھر میں پڑھاتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک کمرہ بنوایا تھا جس کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی منسلک تھا۔ جب مکان فروخت کرنے کے وقت ماں نے کسی بھی بیٹے اور بہو کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو بیٹوں نے نئے مکان مالک کی اجازت سے والد مرحوم کے ایک کمرے کو عارضی طور ماں کے گھر میں تبدیل کیا۔

مکان فروخت کرنے کے بعد دونوں بھائی اپنے اپنے سسرال میں رہنے لگے تھے اور اپنے نئے مکانوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ ماں نے اس چھوٹے سے کمرے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ مرحوم ماسٹر جی کی فیملی پنشن سے اس کی روزمرہ ضروریات

مشکل سے ہی پوری ہوتی تھیں۔ابتداء میں دونوں بیٹے کبھی کبھار ماں سے ملنے کے لئے آتے رہے، پھر کبھی کبھار طویل اور طویل تر ہوتا گیا۔ماں صبح سے شام گئے اس مکان کو دیکھتی رہتی جہاں اس کی پچاس سالہ ازدواجی زندگی کی طویل اور مختصر ان گنت یادیں گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ وہ آنگن کے دروازے کی جانب بھی اکثر دیکھا کرتی تھی شاید دروازہ کھلنے پر اندر باہر سے اس کے بیٹوں کے قدموں کی آواز ابھرے۔

بیٹوں کے گھر بن چکے تھے لیکن اندرونی سجاوٹ کا کام ادھورا تھا اور روپیہ پیسہ کی بے حد کمی محسوس ہو رہی تھی۔اچانک دونوں بھائیوں کی سوچوں میں ایک نئے خیال نے روشنی بکھیر دی۔ماں کے سونے چاندی کے زیورات کے ذکر سے ماں کی صورت بھی دکھائی دینے لگی۔زیورات حاصل کرنے کی غرض سے وہ ماں سے ملنے گئے لیکن ماں کا کمرہ نما مکان بند تھا، دروازے پر ایک بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔وہ حیران ہو گئے اور پریشان بھی۔

"آخر ماں کہاں ہے۔؟"

اسی دوران ایک چھوٹی سی، معصوم سی اور سندر سندر بچی آنگن کے دروازے سے اندر آ گئی۔

"کون ہیں آپ۔۔۔؟ کیا چاہتے ہیں۔"

"یہاں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔آپ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔"

"ہاں ہاں جانتی ہوں"

"وہ کہاں ہے"

"اپنے گھر میں

''کہاں ہے وہ گھر''

''وہ سامنے''

دونوں بھائیوں کی نظریں اپنے آبائی مکان کی جانب اٹھی۔ان کا اپنا مکان ان کی اپنی وراثت۔۔۔لیکن اب اس مکان اور اس وراثت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تو پھر ماں۔۔۔۔۔۔

اتنی دیر میں ایک خاتون گھر سے باہر آئیں اور نہایت نرم لہجے میں کہا۔

''میں آپ کی ساری باتیں سن چکی ہوں۔وہ جانتی تھیں کہ ایک دن آپ ضرور ان سے ملنے کے لئے اس کے گھر کے دروازے پر دستک دیں گے۔۔۔۔۔ان کے سونے چاندی کے زیورات حاصل کرنے کے لیے۔وہ سنبھال کر رکھے ہیں اور میرے پاس ہیں میں ابھی لا کے دیتی ہوں۔''

''لیکن ماں۔۔۔ہماری پیاری ماں۔۔''

''ماں۔۔۔پیاری ماں۔۔کس کی ماں۔۔؟ آپ کی ماں۔۔۔آپ تو اپنی ماں کو اس کچے پکے کمرے کے سپرد کر گئے تھے۔وہ اب ہماری ماں ہے، اس گھر کی ماں ہے اور اپنے کمرے میں رہتی ہے سکون کے ساتھ، آرام کے ساتھ اور میں بیٹی بن کر ان کی خدمت کرتی ہوں۔وہ اسی کمرے میں اپنا وقت گزارتی ہیں جہاں انہوں نے اپنے مرحوم ماسٹر جی کے ساتھ اپنی زندگی۔۔۔ہنستی مسکراتی زندگی۔۔۔عزت و احترام کی زندگی گزاری تھی۔جہاں اس کے مرحوم شوہر کی ان گنت یادیں ان کا دل بہلاتی ہیں۔

انفکشن

کمرے میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹر کی نظریں مریضہ کے چہرے پر بے اختیار رک گئیں اور ایک سریلے انداز میں اپنے دل کی دھڑکنوں کی میٹھی میٹھی پیار بھری آواز اس کے کانوں میں سنائی دینے لگی۔

مریضہ کے چہرے کی ساری خوبصورتی اس کے ہونٹوں میں پوشیدہ تھی۔

''آپ''

''میں عمر ہوں ڈاکٹر صاحب۔۔میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔مریضہ میری بہن ہے۔۔۔رضیہ نام ہے۔''

ڈاکٹر نے رضیہ کے سارے ایکس رے دیکھے، وہ دوائیاں بھی دیکھ لی جو رضیہ کے زیر استعمال تھیں اور ٹمپریچر چارٹ پر بھی نظر ڈالی۔

''دیکھیے یہ بار بار بخار میں مبتلا ہونا صحت مندی کی نشانی نہیں ہے۔ان کے بخار کے پس منظر میں کوئی انفکشن سرگرم ہے اور اس انفکشن کی بنیاد۔۔۔۔''

''کیا مطلب۔۔۔آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' عمر نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''گھبرائیے نہیں عمر صاحب میں اس انفکشن کی بنیار جان چکا ہوں''

''شکریہ۔۔۔جب آپ بنیاد جان چکے تو علاج بھی بتا دیجیے۔''

''آپ یوں کیجیے کسی پیالی میں گرم گرم پانی۔۔۔میرا مطلب ہے ہارٹ واٹر لے آیئے اور تھوڑا سا کاٹن بھی۔۔۔لیکن کاٹن تو یہاں تپائی پر پڑا ہوا ہے صرف

ہارٹ واٹر لائیے۔۔۔''

عمر کمرے سے باہر چلا گیا۔۔۔

ڈاکٹر رضیہ کے چہرے کو دیکھتا رہا، مسلسل دیکھتا رہا، تراشیدہ ہونٹوں کو دیکھتا رہا، ان ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔۔۔ملائم ملائم سے ہونٹ، ملائم ملائم سی مسکراہٹ۔۔۔!

''یہ لیجیے پانی ڈاکٹر صاحب'' ۔۔۔عمر نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا۔۔۔

ڈاکٹر خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

ڈاکٹر نے تپائی پر پڑے کاٹن کا ایک چھوٹا سا حصہ گرم گرم پانی میں بھگو دیا اور پھر رضیہ کے ہونٹوں پر پھیرنے لگا۔

رضیہ جاگ سی گئی۔آہستہ سے اپنی آنکھوں کو جنبش دی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔میرے ہونٹوں پر یہ کیسی تپش ہے۔''

''آپ فکر نہ کیجیے۔میں ڈاکٹر ہوں اور یہ ذرا سی تپش برداشت کرنا پڑے گی۔''

گرم گرم پانی ہونٹوں کو تر کرتا رہا۔۔۔

ہونٹوں کی لالی، ہونٹوں کی مسکراہٹ قائم رہی۔۔!

''عمر صاحب''

''جی کہیے ڈاکٹر صاحب''

''ایک بات جاننا چاہتا ہوں''

''وہ کیا؟''

''ان کو اپنے ہونٹوں پر لپسٹک لگانے کی کیا ضرورت تھی۔اب یہی لپسٹک ایک انجانی انفکشن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔''

''لپ سٹک آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔رضیہ نے کبھی لپ

سٹک استعمال نہیں کی۔۔۔لپ سٹک اور ہمارے ہاں۔۔جی نہیں۔۔۔رضیہ کے ہونٹوں کی لالی اس کی اپنی ہے اور مسکراہٹ بھی اپنی ہے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھوں میں تھاما ہوا گرم گرم پانی سے بھرا پیالہ اچانک فرش پر گر پڑا اور چکنا چور ہو کر رہ گیا۔۔۔!!

آخری خط

صرف دو روز قبل میں اپنی عمر کے ستر سال پار کر چکا ہوں اور جب کبھی میری سوچیں تنہائیوں کے پردے سے باہر آتی ہیں تو پرانے زمانے کی کچھ کچھ کہانیاں آنکھوں کے سامنے خواب بن کر بکھرنے لگتی ہیں اور پھر ناچنے بھی لگتی ہیں۔ دراصل میں ایک پوسٹ مین کی حیثیت سے سرکاری ملازمت سے کئی سال پہلے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ گھر گھر کے دروازوں پر دستک دینا اور ڈاک تقسیم کرنا میری واحد لیکن اہم ذمہ داری تھی اور میں یہ ذمہ داری مخلصانہ انداز میں ایمانداری کے ساتھ نبھاتا رہا۔ شاید اسی وجہ سے میرے ہر حلقے، ہر علاقے، ہر بستی کے لوگ میری کارکردگی سے مطمئن نظر آتے تھے اور ہمیشہ ہنستے مسکراتے مجھ سے ملتے تھے، اپنے گھر کے دروازوں پر میرا استقبال کرتے تھے۔ میری خیر خیریت دریافت کرتے تھے جیسے میں ان میں سے ایک ہوں۔ کبھی کبھی کسی تہوار پر مجھے انعام سے بھی نوازتے تھے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران میں محبت نامے بانٹتا رہا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ ان کے خطوط کی وساطت سے بانٹتا رہا اور جب شام کو خالی بیگ لے کر اپنے گھر کے اندر قدم رکھتا تو میرا ذہن پر سکون ہوتا، ان دیکھے سپنوں سے مالا مال ہوتا لیکن ایک خلش ایک تشنگی ضرور میری سوچوں میں ایک کیڑے کی طرح رینگتی رہتی۔ اس خلش، اس تشنگی سے میں واقف تھا، بخوبی واقف تھا۔۔

میں غیر شادی شدہ تھا۔۔۔۔!

تنہا تھا، اکیلا تھا۔۔۔۔۔۔

اور اب زندگی کے اس موڑ پر مجھے اپنی زندگی کی ایک کہانی یاد آرہی

ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میرا بیگ میرے کسی کام کا نہ رہا تھا۔ وہ بیگ محبت ناموں کے دکھ سکھ کے داستانوں سے بھرا رہتا تھا اب خالی ہو چکا تھا۔

بالکل خالی۔۔۔۔۔!

ایک شام جانے کیا تلاش کرتے کرتے وہ بیگ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ میں نے بیگ کو ہاتھ میں لیا اور گرد غبار سے صاف کر کے اپنے سینے سے لگایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بیگ کے اندر کچھ پڑا ہے۔ میں نے بیگ کھول کر دیکھا ایک خط تھا۔ افسوس ہونے لگا کہ جانے کس کا خط بیگ میں ہی رہ گیا ہے لیکن لفافے پر اپنا نام دیکھ کر حیران ہوا۔ تشنگی بڑھ گئی، لفافہ کھولا تو لکھا تھا۔

پوسٹ مین صاحب

میں جانتی ہوں کہ آپ آج ہی ملازمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں لیکن میں سالہا سال سے آپ کو دیکھتی آ رہی ہوں۔ کبھی بستی میں، کبھی بستی کے کوچوں میں، کبھی میرے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے۔ آپ سے جو کہنا چاہا تھا اب تک کہہ نہ سکی۔ اب میں لفظوں کا سہارا لے کر اپنی بات کہنا چاہتی ہوں، میں شادی شدہ نہیں ہوں، آپ بھی نہیں ہیں۔ آپ بھی میری طرح گھر کی خالی خالی دیواروں کو دیکھتے ہوں گے۔ ہماری عمروں میں زیادہ فرق بھی نہیں۔ کیا زندگی کے اس موڑ پر ہم ایک دوسرے کا سہارا نہیں بن سکتے۔۔!

میرا نام جان کر آپ چونک پڑیں گے۔۔۔۔۔

عابدہ

اور جب حیرانگی کے عالم میں خط کو کئی بار پڑھا تو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس خط کی تحریر کئی سال پرانی تھی۔۔۔۔۔ یہ تحریر اسی دن کی تھی جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔

اور عابدہ کی کہانی کو میرے بیگ نے سنبھال کے رکھا تھا۔۔۔۔

بلاعنوان

ہیلو۔۔۔ہاں ہاں میں عارف بول رہا ہوں۔۔۔۔انکل آپ۔۔۔سب خیریت ہے نا۔۔آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔۔۔کیا ہوا؟ غفور صاحب انتقال کر گئے۔۔۔my God ۔۔۔۔شرافت کے پیکر تھے اور بہت ہی نیک ہمسائے بھی۔۔۔اچھا نماز جنازہ کی تیاریاں ہورہی ہیں۔۔۔جی ہاں مجھے اپنی شرکت کا بھرپور احساس ہے، میں اپنی ہمسائیگی کے فرائض سے بخوبی واقف ہوں۔ پر کیا کروں۔۔۔اس وقت دفتر سے باہر جانا ممکن نہیں۔۔۔آپ شاید نہیں جانتے کہ صبح دس بجے سے پہلے پہلے ہمیں دفتر میں لگی مشین کا بٹن دبانا پڑتا ہے اور اس طرح ہی سے دفتر آنے کی حاضری لگ جاتی ہے۔ پانچ بجے دفتر سے باہر جانے پر ایک بار پھر بٹن دبانا پڑتا ہے۔ ہماری نوکری تو اب ان ہی دو بٹنوں کے درمیان لٹکی ہوتی ہے اور ہاں ان بٹنوں کا کنٹرول کہیں اور ہے۔۔۔۔انکل آپ خاموش کیوں ہوگئے، آپ نے فون ڈسکنٹ کیوں کیا۔۔۔انکل۔۔۔۔انکل۔۔۔۔۔۔!

تلاش

پہاڑوں کے دامن میں لہلہاتے کھیتوں کے درمیان گوجر بستی میں تیندوے کے جان لیوا حملے میں تین معصوم معصوم سے بچے اپنے مستقبل کو سدھارنے اور سجانے کی تمنا میں رنگ بھرنے کے لئے اسکول جاتے جاتے زندگی کی سانسوں سے محروم ہو گئے۔ گوجر بستی میں کہرام مچ گیا۔ بستی کے مرد وزن گھروں سے باہر آئے۔ ایک پر درد ہنگامہ بپا ہوا۔ آنسوؤں کی بارش نے سینے میں جمی برف پگھلا دی اور پھر احتجاج پر احتجاج ہونے لگے۔ متعلقہ اہلکار بھی غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے۔ خوف اور ڈر کے ماحول میں بستی، کھیت اور جنگل ہر طرف ہر تیندوے کی تلاش شروع ہوئی اور یہ سلسلہ کئی روز صبح سے شام گئے تک چلتا رہا لیکن تیندوے کی پرچھائی تک کہیں نظر نہ آئی۔

اور اس شام سارے اہلکار اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ تیندوا بھاگ چکا ہے، یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے اور اب خطرہ بھی ٹل چکا ہے۔ اس کی تلاش اب غیر ضروری بننے لگی ہے اور وہ اپنے تھکے تھکے قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی جانب جانے ہی والے تھے کہ گل محمد اچانک چلا اٹھا۔۔

''ارے محمد رمضان کہاں ہے کچھ دیر پہلے تو میرے ساتھ تھا۔''

اور محمد رمضان نامی اہلکار واقعی وہاں موجود نہ تھا۔ تلاش شروع ہوئی۔۔۔۔

تیندوا ایک اور شکار کر چکا تھا۔ محمد رمضان کی لاش ٹھیک اسی جگہ دیکھی گئی جہاں تیندوا تین بچوں کو نگل چکا تھا۔۔۔!

پرانی کتاب کی نئی کہانی

ان دونوں میں اب طلاق ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان دو برسوں میں ان کی کبھی بھی ایک دوسرے کو دیکھنے یا ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن ڈاکٹر عادل کی بیٹی کی شادی میں وہ دونوں مدعو تھے۔ انہوں نے یہاں ایک دوسرے کو دیکھا تو مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک طویل یادوں بھری کہانی رقص کرنے لگی۔ قریب قریب سارے مہمانوں کے ہاتھوں میں کشمیری قہوہ سے بھری پالیاں اپنی زعفرانی مہک سے ایک سماں باندھ رہی تھیں۔ وہ دونوں جانے کیا سوچتے سوچتے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

"کیسے ہیں آپ امجد صاحب" رضیہ نے پوچھا۔

"بس گزر بسر ہو رہی ہے آپ سناؤ کیسی ہو؟"

"میں بھی مزے میں ہوں۔"

یہ ملاقات آخری ملاقات بننے کے بجائے ان کی لگاتار ملاقاتوں کا ایک وسیلہ بن گئی۔ وہ پھر ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ محبت کی تپش جب چنگاری بننے لگی تو انہوں نے دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کا من بنا لیا لیکن سہ طلاق کی کڑوی کسلی شرط ایک دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دیوار کے اس پار جانے کے لئے رضیہ کی کسی اور سے شادی اور پھر طلاق کے بعد امجد کو پھر سے اپنا لینا ایک غیر یقینی صورت حال اختیار کر گئی۔ وہ دونوں اپنی سوچوں کی دنیا میں گم ہو گئے اور پھر اس کہانی کی دنیا میں رضیہ کی سوچوں میں جیسے گلاب کا کوئی ان دیکھا پھول اگ

آیا۔اس نے امجد سے بات کی اور جب امجد نے رضامندی ظاہر کی تو رضیہ دلہن بنی اور گھر میں کام کرنے والے نوکر شوکت اس کے شوہر کی صورت میں زندگی کے کینواس پر ایک نئے رنگ وروپ کے ساتھ چھا گیا۔

وقت کا پہیہ رفتہ رفتہ سرکتا گیا اور پھر اچانک۔۔۔!

''رضیہ کہاں ہو۔۔۔دروازہ کھولو۔۔۔!'' امجد نے رضیہ کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور رضیہ نیم عریاں لباس میں دروازے پر نمودار ہوئی۔

''رضیہ یہ تم ہو۔۔یقین نہیں آرہا ہے۔اس لباس میں تمہارا حسن اور بھی نکھر آیا ہے۔۔کب آرہی ہو میری زندگی میں دوبارہ۔۔؟ مجھے زندگی کی پراسرار لطافتوں سے لطف اندوز کرنے کے لئے۔۔۔ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔اب ہم ایک دوسرے سے کبھی دور نہیں ہوں گے۔۔۔ہاں! وہ تمہارا نوکر کہاں ہے۔؟ ہاں میں جانتا ہوں کہ تم نے اسے طلاق لے کر اب تک بھگا دیا ہوگا۔۔''

''کون نوکر۔۔۔؟ تم کس نوکر کی بات کر رہے ہو امجد۔۔''

''وہی جس سے تمہاری شادی ہوئی تھی۔چند سکوں کے عوض وہ تمہیں طلاق دینے کے لئے راضی بھی ہو گیا تھا۔''

''او اچھا وہ۔۔۔۔وہاں کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔اندر آجاؤ۔''

رضیہ نے امجد کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔۔۔

''یہاں''

''تم اندر تو آجاؤ۔''

امجد نے جب رضیہ کے خواب گاہ میں قدم رکھا تو اس کی نظریں گھر کے نوکر پر

پڑی۔۔۔شوکت خوبصورت سجے سنورے تکیے کے سہارے نیم لیٹے ہوئے انداز میں کافی پی رہا تھا۔

''میں شاید غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔''

''نہیں نہیں صاحب۔۔۔بالکل نہیں۔۔''شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔

نوکر کی جانب ناراضی ناراضی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے امجد نے خواب گاہ سے باہر آتے ہوئے رضیہ سے کہا۔۔

''میں جا رہا ہوں''

''ضرور جایئے۔۔۔لیکن میری ایک بات بھی سنتے جایئے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو۔۔''

''میں۔۔۔میں تو۔۔!..''

''کہو۔۔''

''میں نے اب اپنے نوکر کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے دن رات گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔۔۔وہ آپ کی نظروں میں نوکر تو ہوسکتا ہے لیکن میرے لئے۔۔۔میرا ہمدم، میرا رفیق اور میرا۔۔۔۔میرا سب کچھ۔۔!''

یہ کہتے ہوئے رضیہ خواب گاہ میں لوٹ آئی اور زور سے خواب گاہ کا دروازہ بند کرلیا۔۔۔!

ایک سوال

کوہ قاف سے اترنے والی پری جب میرے سامنے کھڑی ہوگئی تو میں واقعی گھبرا گیا۔

''بتاؤ مجھے کیوں اس دھرتی پر آنے کے لئے مجبور کیا گیا۔۔۔؟''

''میں جب اپنی سوچوں کی گہرائی میں اترتا ہوں تو تم یاد آجاتی ہو۔۔''

''میں یاد آتی ہوں۔۔! کیوں؟''

''تمہیں اپنا حال دل سنانے کے لئے''

''کیسا حال دل؟۔۔کیا ہے تمہارے سینے کے اندر؟''

''ایک خواہش۔۔۔ایک تمنا۔۔۔ایک آرزو''

''وہ کیا۔۔؟''

''تم اس دھرتی پر آجاؤ، ہمیشہ کے لئے۔۔۔اور اپنا گھر بساؤ''

''یہ گھر کیسے بسایا جاسکتا ہے۔۔؟''

''مجھے اپنا بنا کر مجھ سے شادی کر کے۔۔۔!''

''پھر کیا ہوگا۔۔؟''

''ہماری اولاد ہوگی جو زندگی کی شفافیت کا درس دے گی، انسانی عظمت کا احساس دلائے گی اور ہمارا نام روشن کرے گی۔''

''اور اگر ہماری اولاد اس دھرتی پر منشیات کا سودا کرے گی تو۔۔! بولو، خاموش کیوں ہو گئے؟۔۔۔جواب دو۔۔!''

اور اس سوال کے بعد وہ اڑ کر کوہ قاف کی وسعتوں میں غائب ہو گئی۔۔۔!

بدلے موسم کے رنگ

شادی کے بعدان کی زندگی کے دوسال بے خبری کے عالم میں گزر گئے اوراس بے خبری کے عالم میں ان کے دل کے آنگن کوان گنت مسرتوں نے اس قدر گھیر رکھا کہ موسم بدلنے کے انداز ہی فراموش کر بیٹھے اور جب انہیں موسم کے بدلنے کا احساس ہوا تو ذہنوں میں پوشیدہ خاموشی بھی ایک سوال بن کران کے سپنوں کو چھونے لگی اور پھر یہ سوال آہستہ آہستہ ان کے وارث کے روپ میں بدلتا گیا۔ان کی اتنی بڑی وراثت، اتنی بڑی جائیداد، زمیں، زراعت اور وراثت۔

اس دوران اپنے وارث کی تلاش میں دوسال کی مدت چارسال میں بدل گئی۔ چارسال کے طویل عرصے کے بعد یہ احساس اب حقیقت بن کران کو بے قراری کے ساتھ ساتھ بے بسی کے لمحات سے بھی آشنا کرنے لگا۔کانوں میں شیریں بھرے قہقہیں سنائی دینے لگے،نظروں کے سامنے ننی منی سی چھوٹی سی اور معصوم معصوم سی رنگ برنگی تصویریں دکھائی دینے لگیں۔ یہ سب ہونے کے بعد بھی جب ان دیکھی ،ان جانی مسرتوں نے دل کے دروازے پر کوئی دستک نہ دی تو انہوں نے پیروں فقیروں کی تلاش شروع کردی،تعویذوں کا سہارا لیا۔سمندر پھر بھی پیاسا ہی رہا اور پیاس لمحہ لمحہ بڑھتی گئی۔ پھر اپنا علاج ومعالجہ شروع کیا،اپنے اوپر مختلف نسخے آزمائے اور جب امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی تو رضامندی کے بعد ایک نئی راہ اپنالی،اپنی بھر پور وراثت کو دو حصوں میں بانٹ لیا اور ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ طلاق لے کر یا طلاق دے کر راہیں جدا کرلیں۔عادل اور نازیہ کی خوش رنگ زندگی کو وارث

کی گمشدگی نے بے رنگ بنا دیا۔

وقت کا پہیہ نہ رکا ہے اور نہ رکے گا۔

دونوں نے الگ الگ اپنے اپنے گھر بسا لئے۔۔

عادل نے صفیہ سے شادی کر لی، عادل کو گھر ملا، وراثت ملی اور بیوی بھی۔۔

نازیہ نے جمال کو اپنا لیا۔۔۔نازیہ کو جمال ملا اور وراثت بھی۔۔

اور اس طرح عادل اور نازیہ کا رشتہ ٹوٹے آئینے کی لکیر میں سمٹ کر رہ گیا۔

زندگی آگے بڑھتی رہی۔۔۔

دوسری شادی کے بعد بھی زمین بنجر ہی رہی۔بنجر زمین کا کرب قائم ودائم رہا اور وقت ایک بار پھر بے خبری کے عالم میں سرکتا رہا، سسکتا رہا۔

اور اچانک ایک شام بہت مدت بعد کسی جانی پہچانی شادی کی تقریب میں عادل اور نازیہ کی ملاقات ہوئی۔دونوں کا ایک دوسرے کا قریب سے گزر ہوا، دونوں رک گئے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔۔۔جانے کن نظروں سے، کن سوچوں سے اور خاموشیوں سے۔۔۔شاید ان کے دل کی پیاس اور ان کی سوچوں کی چاہت کو اب بھی وارث کی تلاش تھی اپنی اپنی وراثت کے لئے۔۔!

لیکن موسم اب بن برسے ہی اپنے سارے انداز بدل کر تھک چکا تھا۔

آخری سیڑھی

گردھاری جی کا دفتر ایک منزلہ مکان سے آٹھ منزلہ بلڈنگ کی پانچویں منزل میں منتقل ہو گیا تھا اس وجہ سے ان کے لئے لفٹ کا استعمال لازمی بن گیا تھا لیکن وہ لفٹ میں چڑھنے سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک انجانے خوف سے ان کا سارا وجود تھر تھرانے لگتا تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لفٹ ان کے لئے موت کا کنواں ہے۔ پانچویں منزل پر پہنچنے کے لئے ایک سو ساٹھ سیڑھیاں چڑھنا اور پھر چھٹی کے وقت دوبارہ ان سیڑھیوں سے اترنا، یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اتوار کو چھوڑ کر یہ ان کا معمول بن گیا تھا حالانکہ بڑھتی عمر کے لحاظ سے یہ عمل ان کے لئے مشکل تھا۔

دو ماہ کے مختصر عرصے کے بعد گردھاری جی ملازمت سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ اس کے بعد نہ آٹھ منزلہ بلڈنگ کی پانچویں منزل ہوگی اور نہ اتنی تکلیف دہ سیڑھیاں۔ تب وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں ہوں گے جہاں نہ کوئی لفٹ ہے نہ ان گنت سیڑھیاں۔۔۔۔

گردھاری جی کی پریشانی دیکھ کر ان کے ساتھیوں نے انہیں دلاسہ دیا، لفٹ کی نزاکتوں اور آسائشوں سے انہیں واقف کرنے کی کوشش کی اور ساتھیوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ دفتر آنے اور جانے کے وقت ان کی تسلی کے لئے دو تین ساتھی ان کے ساتھ ہی لفٹ میں چڑھا کریں گے۔ اب گردھاری جی صبح دفتر کے لئے نکلتے تو لفٹ کے پاس روز دو تین ساتھی ان کے انتظار میں ہوتے اور پھر چھٹی کے وقت ان کے ساتھ لفٹ میں چڑھتے اور انہیں رخصت کرتے۔ یہ اب روز کا معمول بن چکا

تھا۔

وقت کے لمحے پگھلتے رہے، ان دیکھی فضاؤں میں گم ہوتے رہے۔ جب گردھاری جی کی سبکدوشی کا دن آیا تو انہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے اترنے کی خواہش ظاہر کی۔ ساتھیوں نے لفٹ سے اترنے کے لئے بے حد اصرار کیا لیکن وہ نہ مانے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے استدعا کی کہ وہ گراؤنڈ فلور پر ان کا انتظار کریں۔ ان کے ساتھی لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آ گئے اور گردھاری جی کا انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے گردھاری جی کو تھکی ہوئی ٹانگوں سے تیسری منزل تک پہنچتے دیکھا۔ وہ بغل میں پینشن کے کاغذات دبائے اپنے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ جب انہوں نے گراؤنڈ فلور کی طرف جانے والی سیڑھی پر قدم رکھا تو تالیوں کی گونج میں گردھاری جی کی آواز ابھری۔۔۔۔

''میں اب یہاں نہیں آ سکتا، آؤں گا بھی نہیں کیونکہ اس آٹھ منزلہ بلڈنگ کی پانچویں منزل سے میرا واسطہ ختم ہو چکا ہے لیکن مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں ایک سو ساٹھ سیڑھیوں کو اپنے قدموں سے ناپ چکا ہوں۔ اپنے ان ہی کمزور قدموں کی بدولت ان سیڑھیوں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں نا۔۔۔۔!''

تالیوں سے ابھرنے والی دل پسند موسیقی ختم ہو گئی۔ ہر جانب خاموشی چھا گئی اور ایسی خاموشی کے پس منظر میں گردھاری جی گراؤنڈ فلور کے چکنے چکنے فرش پر گر گئے۔ پینشن کے کاغذات ہر جانب بکھر گئے، گردھاری جی گراؤنڈ فلور کے چکنے فرش پر سو چکے تھے۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔!

سرکاری غیر سرکاری

یوں تو میں ظاہری طور پر اخبار پڑھ رہا تھا لیکن میری نظریں سامنے والے سبزیوں سے بھرپور دکان کی جانب تھیں اور میں سبزی فروش کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔اس نے دو نرخ نامے تیار کر لئے تھے ایک سرکاری کرمچاریوں کی جانچ پڑتال کے لئے، سرکاری کرمچاری جب بھی جانچ پڑتال کے لئے آتے وہ سرکاری نرخنامہ پیش کرتا اور دوسرا عوام کے لئے، اپنے خریداروں کی جانکاری کے لئے۔۔۔!

ایک سرکاری نرخ نامہ اور دوسرا غیر سرکاری نرخنامہ۔۔۔۔۔۔

ایک تصویر کے دو رخ۔۔۔۔!

یوں بھی کہہ سکتے ہیں ایک ہی سبزی فروش کے دو چہرے،ایک سرکاری اور دوسرا غیر سرکاری۔۔۔۔۔!!!

پسند اپنی

میرے سامنے جو اخبار پڑا ہے اس کا ایک کالم ''سوال و جواب'' مجھے بہت پسند ہے اور میں ہمیشہ اس اخبار کا یہی کالم سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ایک سوال جو مجھے پسند آیا آپ کو بھی سناتا ہوں۔

سوال:-آپ اپنے اخبار کا ایک صفحہ صرف علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لئے مخصوص رکھتے تھے۔اب یہ کالم غائب ہوتا ہوا نظر آرہا ہے کوئی وجہ تو ہوگی۔۔؟

جواب:-اب اس قدر اشہارات ملنے لگے ہیں کہ علم و ادب اور ثقافت کی جانب دھیان بھی نہیں جاتا۔۔۔!

سیاست

پچاس سے زائد نوجوانوں نے اپنی سیاسی دنیا کو نیا رنگ وروپ دینے اور جدید
سیاسی ڈھانچے میں ڈھالنے کے لئے نئی پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ملک وقوم کی
موجودہ صورت حال بہتر بنانے کے لئے اپنی ذمہ داریاں نبھانے کا عہد کیا اور اس
طرح ایک اور سیاسی پارٹی وجود میں آئی۔اس پارٹی میں شمولیت کی غرض سے یہ
نوجوان نئی پارٹی کے سٹیج پر نظر آرہے تھے اور ملک وقوم کی صورت حال بہتر بنانے کا
عہد کررہے تھے۔۔۔اور۔۔۔من میں اپنی صورت حال بہتر بنانے کا عہد
کررہے تھے۔۔۔!

نئی نسل

شام ابھی اتر چکی تھی لیکن سنٹرل مارکیٹ کے قہوہ خانوں کی زندگی شباب پر تھی۔لوگوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آرہی تھی۔لوگ آرہے تھے، جا رہے تھے۔ پارکینگ میں اپنی کار رکھنے کے بعد ہم ایک مصروف قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔کافی دیر وہاں بیٹھے رہے،موسیقی اور زعفرانی قہوہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

واپسی پر کار پارکینگ میں کتوں کی ایک بڑی تعداد نظر آرہی تھی۔میرا دوست ان کتوں کی جانب دیکھے جارہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ کتے ہیں۔۔۔کتے۔۔''

''ہاں کتے ہی ہیں میں دیکھ رہا ہوں مگر۔۔!''

''مگر کیا۔۔؟''

''کتوں کی یہ نسل جانے کب اور کہاں سے وادی گلپوش میں وارد ہوئی ہے۔ اس نسل اور اس شکل وصورت کے کتے تو میں نے ساوتھ افریقہ میں دیکھے تھے، چار سال پہلے جب میں بزنس ٹور پر وہاں گیا تھا۔''

''ضرور دیکھے ہوں گے۔کوئی انوکھی بات ان کتوں یا اس نسل سے منسلک ہوگی تب ہی تو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔''

''ہاں یاد آرہا ہے۔۔۔یہ نسل عجیب سی ہے۔کچھ اس طرح سے کاٹ لیتی ہے کہ احساس تک نہیں ہوتا۔۔۔ذرا بھر جنبش بھی نہیں ہوتی۔''

''یار جانے دو ان پرانی بوسیدہ باتوں اور یادوں کو۔۔۔فی الحال تو ہم ان کی

کاٹ سے بچ گئے۔۔اب دیر ہو رہی ہے، سردار راجندر سنگھ سے بھی ملنا ہے۔میرا
چیک پڑا ہے اس کے پاس۔"

"ہاں ہاں وہاں سے ہوتے ہوئے گھر چلیں گے۔۔دیکھ یہ کتے۔۔!
دیکھ نا ہمارے آس پاس کتنے سارے کتے دکھائی دے رہے ہیں۔جب ہم
آئے تھے تو کار پارکینگ میں ایک بھی کتا نظر نہیں آ رہا تھا۔"

"اب تو ہم جا رہے ہیں، ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔شاید انہیں ہماری زعفرانی
خوشبو پسند آئی ہو گی اسی لیے ہمارے آس پاس گھومنے پھرنے لگے ہیں۔"

رات گئے وہ سردار راجندر سنگھ کے ہاں سے لوٹنے لگے تو پھر گھر جانے کے
بجائے انہیں ہسپتال کا رخ کرنا پڑا۔دونوں دوستوں کو نئی نسل کے کتے کاٹ چکے تھے
اور انہیں اس کاٹ کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

مرد نامرد

''تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟''

''ہاں دل وجگر سے''

''میں کچھ کہوں مان جاؤ گے''

''آزما کر دیکھیے''

''کوئی کام انجام دینے کے لئے اگر تمہاری ضرورت پڑے تم آؤ گے۔''

''ضرور آؤں گا۔''

''اگر اس کام میں کوئی خطرہ ہوا۔''

''میری گردن تمہارے قدموں میں ہوگی۔''

''اگر ہماری محبت میں کوئی دیوار کھڑی ہوئی تو۔۔؟''

''میں اسے گرادوں گا۔''

''اگر میرے لئے خون بہانا پڑے۔؟''

''میں دریغ نہیں کروں گا۔''

''اگر میں تمہیں احمق بناؤں۔۔۔۔ برا تو نہیں لگے گا۔''

''نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔''

''ایک اور سوال۔۔۔شاید آخری سوال۔''

''کہیے۔''

''میں تمہیں کہہ دوں کہ مر جاؤ۔۔۔۔۔اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے فرار

حاصل کرلو۔۔تو ؟۔۔۔۔"

"ایسا ہی کروں گا۔۔۔اپنی جان دوں گا۔"

"پر ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں تمہیں اپنا نہ سکوں گی۔"

"کیوں۔۔؟ ایسا کیوں۔"

"اس لئے کہ تمہاری زندگی کی ڈکشنری میں "نا" کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ مجھے ایک غلام کی نہیں بلکہ ایک مرد کی ضرورت ہے۔"

"اور میں۔۔۔؟"

"تم ایک مرد ہو کر بھی نامرد ہو۔۔۔۔۔تم میں "نا" بولنے کی شکتی ہی نہیں ہے۔"

آزادی

ہماری زمین بھی کتنی سخت جان ہے۔انسانی خون کو اس طرح سے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے کہ مٹی ذرا بھی نم نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنا رنگ بدلتی ہے لیکن وقت بدلنے کے ساتھ ہی یہی خون مٹی سے ابھر کر سرخ سرخ گلابوں کا روپ اپنا لیتا ہے اور سخت جان زمین معطر ہو کر آزادی کا سانس لینے لگتی ہے۔۔۔!

ماسک

یوں تو اس نے اپنے چہرے کو ماسک میں چھپا لیا تھا لیکن ماسک کے اندر چھپا ہوا چہرہ تیزاب کی دھار برداشت نہ کر سکا اور پچیس سالہ معصوم لڑکی کالج جاتے جاتے ہسپتال جا پہنچی۔

جانے اب اس داغ دار چہرے کے تعلق سے اندر باہر کتنی ان دیکھی، ان جانی کہانیاں سڑکوں پر بکھر جائیں گی اور میڈیا کا حصہ بن جائیں گی۔۔۔!!!

قربانی

اپنے والد اکرام الدین کی وفات کے وقت فوزیہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اکرام الدین سرکاری عہدہ دار تھے اس لئے ان کی بے وقت موت کی وجہ سے ان کی بیوی کو فیملی پنشن حاصل کرنے میں زیادہ دقت نہیں آئی۔ ان کا مکان دو منزلوں پر مشتمل تھا۔

ایک منزل ماں بیٹی کے اپنے استعمال کے لیے کافی تھی اس لیے دوسری منزل کرایہ پر دے دی۔ اگر چہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ملنے والی رقم سے ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا پھر بھی ماں اپنی بیٹی کی پڑھائی لکھائی کے لیے روپیہ پیسہ بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ فوزیہ کو اپنی ماں اور ماں کو اپنی بیٹی پر اعتماد تھا، بھروسہ تھا۔ فوزیہ ہمیشہ اپنی ماں سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی اور ماں کے لہجے میں بھی ہمیشہ محبت اور شفقت ٹپکتی تھی۔ ان کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کبھی دھیمے اور کبھی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے گئے اور اس دوران فوزیہ ایم۔ اے اور ایم۔ ایڈ کرنے کے بعد ٹیچر کے عہدہ پر بھی تعینات ہو چکی تھی اور ماں کی عمر کی رفتار بھی دہلیز پر آ چکی تھی۔ اب اسکول سے آنے کے بعد گھریلو کام میں مصروف ہونا اس کی عادت بن چکی تھی۔ البتہ ماں بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی دیکھنے کے بعد اس جہاں سے رخصت ہونا چاہتی تھی لیکن بیٹی شادی کی بات سن کر اپنی گردن نہ میں ہلا دیتی۔ اس کے من میں کیا تھا ماں اس بھید سے بے خبر تھی، ناواقف تھی لیکن وہ اپنی بیٹی کے رکھ رکھاؤ سے پوری طرح مطمئن تھی۔

ماں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ابھی چالیس ہی دن ہوئے تھے کہ رشتے آنے لگے۔ فوزیہ ہر بار انکار میں سر ہلا دیتی۔۔۔!

اور ایک دن سارے رشتہ دار، پڑوسی ، جان پہچان والے حیران رہ گئے جب فوزیہ نے خود ہی تصدیق کی کہ وہ شہر کے امیر ترین شخص سے شادی کرنے کے لئے ہاں کر چکی ہے اور یہ عبداللہ صاحب تھے۔ یہ ان کی تیسری شادی تھی، پہلی بیوی کو طلاق دیا تھا، دوسری بیوی مر چکی تھی۔ ان کی کوئی اولاد بھی نہ تھی اور اب وہ بزرگوں کی صف میں شامل ہونے کے بعد بھی تیسری شادی کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔

سب کی کہی کو ان کہی میں تبدیل کرنے کے بعد فوزیہ اور عبداللہ صاحب شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ بوڑھا گھوڑا لال لگام کی کہانی زندگی کی کتاب میں شامل ہو چکی تھی۔

یہ کہتے سنتے دو سال خاموشی سے بیت گئے۔

وہ بے حد اداس شام تھی جب عبداللہ صاحب ایک کار حادثے میں جان بحق ہوئے۔۔۔ عبداللہ صاحب مرحوم اپنی ساری جائیداد۔۔۔ سونا چاندی، بینک بیلنس، کوٹھی، کار اور بڑا سا پشمینہ سازی کا بزنس۔۔۔ اپنی ہر شئے، ہر ایک چیز فوزیہ کے نام کر چکے تھے۔

باتوں کو ہوا مل گئی تھی اور ہوا نے افواہوں کی آگ اور بھی بھڑکا دی۔ اپنے پرائے، ہمسایہ اور رشتہ دار اب مطمئن ہو چکے تھے کہ عبداللہ صاحب سے شادی کا مقصد صرف اور صرف اس کی جائیداد حاصل کرنا تھی۔

اور پھر حیرانگی کا نیا عالم سامنے آ گیا۔۔۔۔۔

فوزیہ نے مرحوم عبداللہ صاحب کے عالیشان مکان کو یتیم خانہ میں بدل دیا۔۔۔ عبداللہ یتیم گھر۔۔۔ یتیم بچوں کی پڑھائی لکھائی، کھانا پینا، رہن سہن اور

ہنستی مسکراتی زندگی گزارنے کے بہت سارے راستے ہموار ہو گئے۔

عبداللہ صاحب سے شادی کرنے کا اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اب وہ اکیلی تنہا اپنے آبائی گھر میں رہ رہی تھی۔۔۔۔!!

ڈوب گئے ہم ساحل پر

ایک بڑی سی بستی کے بازاروں میں بھیک مانگتے مانگتے ہر روز ایک دوسرے کو ان گنت بار دیکھنا ان کا معمول بن چکا تھا۔ جب ان کی نظریں ٹکراتیں تو لمحہ بھر کے لئے ان کی آنکھوں میں ایک نئ محبت کی کہانی دکھائی دیتی۔ گزرتے لمحوں کے ساتھ کہانی نے مسکراہٹ کا سہارا لیا اور اس طرح مسکراہٹ کو زبان ملی۔ زبان نے دل کی بات کو محبت بھری سوچ میں بدل دیا اور ایک معتبر بھری راہ ہموار کرلی۔ وہ دونوں اب بھی معمول کی طرح دن بھر الگ الگ انداز اور الگ الگ لہجے میں بھیک مانگتے اور رات اترنے سے پہلے اپنی اپنی کمائی کے ساتھ اپنے اپنے مٹی سے بنے آشیانے کے ایک کمرے میں گم ہوجاتے۔ ان کے کمرے ایک دوسرے سے دوری پر تھے۔ ان کے آس پاس ایسے بہت سارے کمرے تھے جہاں صرف بھکاری رہتے تھے، کچھ اکیلے اور کچھ اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ ان میں بہت ساری عورتوں نے اپنے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چل کر مزدوری کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ کچھ بھکاری صحت مند اور جوان ہونے کے باوجود گلی گلی، گھر گھر، دکان دکان اپنا دامن پھیلاتے نظر آتے، ان میں وہ دو بھی شامل تھے۔ پھر یوں ہوا کہ وقت نے ایک عجیب سی انگڑائی لی۔ وہ دن بھر کی کمائی یہ جانے بغیر کہ کس کی کتنی کمائی ہوئی ہے دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے کمروں کی تنہائیوں میں سمٹ جاتے۔ دونوں کو جب ان تنہائیوں کا احساس ہونے لگا تو ایک دوسرے کے تئیں چاہت میں نکھار آنے لگا۔ کافی سوچ بچار کے بعد دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

بستی کے بہت سارے مکینوں کی موجودگی میں انہوں نے ایک دوسرے کو مالا پہنائی۔ شادی کی پہلی رات انہوں نے اپنے اپنے کمروں میں گزاری۔ بھکارن رات بھر جانے کیا کیا خواب سجاتی اور سنوارتی رہی۔ خوابوں کی دنیا میں کتنی دور تک چلی گئی اور بھکاری رات بھر سوچتا رہا دلہن کے بارے میں کم، اپنے بارے میں زیادہ۔ دوسری کے بعد تیسری رات بھی آئی لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دونوں دن بھر ایک ساتھ بھیک مانگتے نظر آتے اور شام اترتے ہی اپنے اپنے کمروں میں گم ہو جاتے۔۔۔۔

ایک شام بھکارن نے اپنی گھر گرہستی سنبھالنے کے لئے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور بھکاری کے گھر میں قدم رکھ کر اپنی سانسوں کو سنبھالا لیکن اس کی سانسیں دن بھر کے اجالوں کی نذر ہو گئیں اور راتیں کائنات میں رنگ بھر بھر کر غائب ہوتی رہی۔ ان کی کہانی۔۔۔۔ ان کی محبت کی کہانی دن کے اجالوں اور رات کے اندھیروں سے گزر کر بھی بے عنوان ہی رہی۔

ایک رات عجیب سی بات ہوئی، بھکاری نے دیکھا کہ اس کی بیوی، اس کی محبوبہ آہستہ آہستہ قدموں سے باہر جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ چونک پڑا کہ ان کے دروازے سے ذرا دوری پر ایک کار کھڑی ہے اور کار کا ایک دروازہ کھلا ہے۔ بھکارن کار کے اندر چلی گئی۔۔۔۔۔ دروازہ بند ہوا اور کار جانے کس جانب دوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے بھکارن اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور آہستہ آہستہ قدموں کے سہارے اپنے بستر میں گھس گئی۔

جانے کیوں بھکاری سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہا۔۔

اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن ایسا ہی ہونے لگا۔ وہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا، اپنی خاموشی پر جانے کیا کیا سوچتا رہا۔۔۔

بہت سارے دن خاموشی کی چادر اوڑھ کر گزر گئے۔۔۔!

پورے چاند کی رات تھی، کار رکنے کی آواز بھکاری کو سنائی دی۔ بھکارن حسب معمول خاموش خاموش قدموں کے سہارے کمرے سے باہر جانے لگی۔ بھکاری نے اپنے سر سے لحاف سرکا کر اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔

''رک جاؤ'' ......

''لورک گئی پھر۔۔!''

''یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ رات کے وقت چپ چپ کر کہاں جارہی ہو۔؟''

''یہ کیوں ہو رہا ہے اب بھی تم اس بات سے بے خبر ہو۔ ہاں میں نے تم سے محبت کی اب بھی تم کو چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ بہت چاہتی ہوں کہ تم میری پہلی اور آخری پسند ہو لیکن میری پسند، میری چاہت کچھ اور بھی چاہتی ہے اور تم وہ دے نہیں سکتے۔۔ تم بزدل ہو، اپنی اندر کی بات زبان پر لانے سے ڈرتے ہو۔''

''تم بھول رہی ہو کہ میں مرد ہوں اور تم عورت۔۔۔۔۔''

''ہاں میں جانتی ہوں کہ میں عورت ہوں اور تم مرد ہو لیکن تم بھول رہے ہو کہ تم مرد ہو کر بھی۔۔۔۔۔۔!''

''خاموش ہو جاؤ میری جان۔۔! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ ہم تو اپنے ساحل پر ڈوب گئے ہیں۔۔۔ تم جاسکتی ہو۔۔ جلدی لوٹ آنا اور ہاں اب اس دروازے کو کھلا ہی رہنے دو۔۔۔۔''

پہلی ملاقات کے بعد

رقیہ اور خاور کے رشتے کی بات چل پڑی تو ان کے والدین نے یہ مناسب سمجھا کہ بات آگے بڑھانے سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے مل کر اپنی رضا مندی کا اظہار کریں۔ اسی پس منظر میں ایاز اپنی بہن رقیہ کے ساتھ خاور سے ملنے کے لئے مقرر جگہ پر پہنچے۔ وہاں خاور اور اس کی بہن حاجرہ محو انتظار تھے۔ رسمی تعارف کے بعد مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ ہنسی مذاق بھی ہوا اور نفیس سی چائے پینے کے بعد دونوں اپنا کوئی فیصلہ سنائے بغیر رخصت ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد دونوں نے اس رشتے سے انکار کیا لیکن وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ حاجرہ اور ایاز اس پہلی ملاقات میں ایک دوسرے کو پسند کر چکے تھے۔۔۔!

جانے بھی دیجیے

30 نومبر 2021ء

آج یہاں ایک سرکاری نشست میں بجلی کی فراہمی کی موجودہ صورت حال پر پوری تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوئی اور کئی امور زیر بحث آئے۔موجودہ حالات و واقعات اور عوامی مشکلات کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ صارفین کو اب چوبیس گھنٹے بجلی فراہم ہوگی۔اس تعلق سے ضروری اقدامات اٹھائے گئے ہیں اور ہدایات بھی جاری کئے گئے ہیں۔عوام کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ انہیں آج سے اس معاملے میں احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اب یہ عوام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بجلی کی مسلسل فراہمی کے لئے اپنا تعاون پیش کریں اور بجلی کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

3 دسمبر 2021ء

آج یہاں ایک سرکاری نشست میں بجلی کی موجودہ صورت حال اور اس کی فراہمی کے تعلق سے طویل گفتگو کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ عوامی ضرورت کے مطابق بجلی کی فراہمی سرکار کے لئے مشکل ہے۔اس لئے جب تک بجلی کی فراہمی کی مختلف تجاویز کو عملی صورت نہیں ملتی تب تک بجلی کی کٹوتی ناگزیر ہے اس لئے کٹوتی اب چار گھنٹوں کے بجائے سات گھنٹوں کی ہوگی۔نیا شیڈول ترتیب دیا جا چکا ہے اور اسے آج ہی منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔عوام سے التماس ہے کہ وہ بجلی فیس مقررہ وقت پر ادا کیا کریں اور بجلی کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

15 دسمبر 2021ء

کس پر اعتبار کریں۔اعتبار کا لفظ شاید بجلی کی ڈکشنری سے غائب ہو چکا ہے۔بجلی کی روشنی تو بجھ چکی ہے، اعتبار کی بحالی کے لئے اب شاید چراغوں کی روشنی کا سہارا لینا پڑے لیکن چراغوں کی فراہمی کے لئے سرکاری یا غیر سرکاری طور پر ایک اور نشست کا اہتمام کرنا ہوگا۔۔۔۔اور تب تک۔۔۔۔؟

اندھیرے کے بادل۔۔۔۔!

جانے بھی دیجیے۔۔۔!

ماضی کی تلاش

کل شب میں شب بھر لمحہ لمحہ سوچتا رہا اور لمحہ لمحہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا، میری اپنی خواب گاہ کی سامنے والی دیوار پر آویزاں فریم میں بن سنوری تصویر کو۔۔۔جو میری اپنی تصویر ہے۔۔!

ان کہی

میرے یار دوستوں میں اکثر گلابی اور شہابی ہیں لیکن جب پینے لگتے ہیں تو بن جاتے ہیں شرابی، علم کی باتیں ہوں تو بن جاتے ہیں کتابی، سیاست چھڑ جائے تو بن جاتے ہیں انقلابی ۔۔۔۔ گلابی، شہابی، شرابی، کتابی، انقلابی ۔۔۔۔ یہ باتیں خوبصورت ہیں، یہ الفاظ پرکشش اور پر معنی ہیں، یہ جملے مسلسل اور رواں دواں ہیں مگر کس قدر متضاد ہیں میرے یار دوستوں کی طرح ۔۔۔!

انسان اور حیوان

میرے اندر کا حیوان جب کبھی بھی انسان بن کر میرے جسم سے باہر آتا ہے تو باہر آتے ہی ہر ایرے غیرے، ہر اپنے پرائے کو انسان ہو کر بھی آشنا کرتا ہے اپنی حیوانیت سے۔۔۔۔!

زمین پیاسی ہے

محبت نے ان کے دلوں پر ان کی پہلی ملاقات میں ہی دستک دی تھی اور پھر ان دونوں کو ایک ہی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ تعلیم کے دوران بھی ان کی محبت کی چنگاریاں بجھ نہ پائیں۔ اب وہ ڈاکٹر بن چکے تھے اور ان کی شادی ہوئے بھی چار سال بیت چکے تھے لیکن اب تک بے اولاد تھے اور بے اولاد ہونے کا انہیں بے حد دکھ بھی تھا۔۔۔

شہر خاص کے ایک موزوں اور مصروف بازار میں ان کا اپنا ایک کشادہ اور خوبصورت کلنک تھا جہاں وہ اپنے مریضوں کا علاج و معالجہ کرنے میں لمحہ لمحہ مصروف رہتے تھے۔ ان کے کلنک کے باہر ایک بڑا سا بورڑ آویزاں تھا۔۔۔ اور جس پر لکھا تھا۔۔۔ ''بے اولاد جوڑوں کے لئے خوشخبری۔''

آیئے اور ہمارے علاج سے اولاد کی نعمتوں سے مالا مال ہو جائیں۔۔۔!

درویش نما

بظاہر گلزار شیخ ایک صاف ستھری شخصیت تھی۔ اس کے لب و لہجے کی سادگی اور شرافت کشش رکھتی تھی۔ دھیمی آواز میں نظریں جھکا کر بات کرنا اس کی ایک انمول عادت تھی۔ اس کی بدولت اس کے ہمسائے، دوست اور رشتے دار نہ صرف اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ دھیمے دھیمے میں اس کی خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے تھے لیکن جب سے منشیات کے سانپ نے ڈسنا شروع کیا تھا، بستی کے سارے لوگ اپنے بچوں کے حوالے سے فکر مند تھے۔ ان کی پریشانیاں بڑھنے لگی تھیں۔ اس بدعت سے دور رہنے کے لئے غور و فکر کے مختلف دروازے واہ ہوگئے۔ گلزار شیخ نے اپنی دھیمی آواز میں مختلف تجاویز پیش کیں۔ مشورے دیئے۔ ان مشوروں میں ان کا خلوص دکھائی دے رہا تھا اور بچوں کے تئیں اس کی فکر مندی بخوبی ظاہر ہو رہی تھی۔ پولیس بھی حرکت میں آچکی تھی۔ مجرم کی تلاش شروع ہوئی اور پولیس دو سو گرام چرس اور بیس ہزار نقدی سمیت مجرم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ گاؤں والوں نے راحت کا سانس لیا لیکن ان کی آنکھوں میں حیرانگی کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ مجرم کوئی اور نہیں بلکہ ان کا درویش نما دوست گلزار شیخ تھا۔۔۔۔۔!

زندگی کے دو لفظ

وہ شاید نیم دیوانی تھی اور اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باوجود بھی نیم عریاں نظر آتی تھی۔ کچھ عرصہ سے وہ شہر کے سب سے بڑے لڑکیوں کے کالج گیٹ کے بالکل قریب کالج کھلنے اور بعد دوپہر کالج بند ہونے کے وقت نظر آتی تھی اور چلا چلا کر کہتی:

''اپنے جسم کو سنبھالو۔۔۔اپنے جسم کو بچالو۔۔ یہ دنیا بڑی بے رحم ہے معصوموں کو جینے نہیں دیتی۔۔!''

کالج آنے جانے والی لڑکیاں اب اس کی آواز سے اس قدر مانوس ہو چکی تھیں کہ کوئی بھی اس کی جانب توجہ نہ دیتا۔ اب اس کی آواز کو بے آواز کر کے نظر انداز کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔

ایک روز رابعہ نے جانے کیسے اپنے گھر میں کھانا کھانے کے وقت اس کا ذکر چھیڑا۔ رابعہ کی ماں غور سے سنتی رہی اور من ہی من میں جانے کیا سوچتی رہی۔ زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹنے لگی اور پھر کئی دن بعد اس نے رابعہ کے ساتھ کالج تک جانے کی اپنی دبی ہوئی خواہش کا اظہار کیا۔ رابعہ کے کیوں اور کس لئے کہنے کے باوجود ماں خاموش رہی اور اپنی بات پر بضد رہی۔ دو تین دن بعد وہ رابعہ کے ساتھ کالج تک چلی آئی۔ وہ نیم پاگل حسب معمول گیٹ کے گوشے میں اپنی باتیں دہرا رہی تھیں۔ ماں نیم دیوانی کو دیکھتی رہی، سوچتی رہی، خدوخال ذہن کے گوشوں سے ابھارتی رہی اور پھر اچانک اس کی آواز سنائی دی۔

''خانم۔۔۔تم۔۔۔۔اس حالت میں۔۔''

نیم دیوانی ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔اس کے ہونٹوں کی جنبش رک گئی''

میں نے تم کو پہچان لیا خانم''

رابعہ خاموشی سے کالج کے اندر چلی گئی اور ماں اپنے گھر لوٹ آئی۔

اور ایک دن جب گھر کے سارے افراد ڈنر لے رہے تھے تو رابعہ نے پھر نیم دیوانی کی بات چھیڑی۔۔۔ماں نے کہا۔۔۔۔''میں صرف اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے وہ خانم ہے۔جب میں سروس میں تھی وہ میرے اسکول کی ایک ہونہار طالبہ تھی، پڑھنے لکھنے کے تعلق سے بڑی قابل۔۔۔۔لیکن ایک دن جانے کس درندے کی درندگی کا شکار ہوگئی اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہوگئی۔۔۔۔لیکن اب اپنی زندگی کے اندھیاروں سے باہر آئی ہے اور نیم دیوانگی کی حالت میں اسکول یا کالج آنے جانے والی بچیوں کو سماج کے ان درندوں سے بچانے کے لئے اپنی آواز بلند کر رہی ہے۔۔۔زندگی کو سنبھالنے، سدھارنے کا ایک پیغام دے رہی ہے۔۔اپنی زندگی کے دو لفظ سنا رہی ہے۔''

زندگی کے یہ دو لفظ کتنے کڑوے کسیلے ہیں۔۔۔!

پہرے دار

نئی نسل کے شعراء میں اپنے کلام کی بدولت ارسلان اختر اپنی مقبولیت سے بے حد سرشار نظر آرہے تھے۔ دراصل ان کی آواز بہت پراثر تھی۔ وہ اپنے اشعار ٹھہر ٹھہر کر سناتے تھے اور داد حاصل کرتے تھے لیکن اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا کہ ان کا مٹھاس بھرا یہ کلام ان کے والد محترم احمد امین کی ادبی صلاحیتوں کا آئینہ تھا۔ وہ کئی برس قبل ایک حادثے میں نہ صرف اپنی دونوں ٹانگوں بلکہ اپنی آواز سے بھی محروم ہو چکے تھے لیکن قلم اور کاغذ اب بھی ان کی انگلیوں میں جان ڈال رہے تھے اور ان کے بیٹے ارسلان اختر اپنے نام اور آواز سے ان محفلوں کو سجا رہے تھے۔ وہ شاید ایک پہرے دار بن کر اپنے والد محترم کے شعری کلام کی پہرے داری کر رہے تھے۔

دو رنگ

ایک استاد کی حیثیت سے ماسٹر بدرالدین کو اپنی ملازمت کے دوران اپنی یا کسی نزدیکی بستی کے کسی اسکول میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے جب ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی بستی اور اپنے گھر میں رہنا شروع کیا تو بستی کے اکثر لوگ ان کے نام اور کام سے ناواقف تھے۔ اپنے گھر میں رہنے سے بستی والوں سے ملنا جلنا ہوا اور خاص طور سے نماز کے وقت وہ ہمیشہ مسجد میں موجود ہوتے۔ اس وجہ سے بھی بستی والوں کے دلوں میں ان کے لئے عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ ماسٹر جی باتیں بھی خوب کرتے تھے، خاص طور سے دینی باتیں۔۔ وہ بستی والوں کو اللہ کے سامنے سربسجود ہونے ہونے کی تلقین کرتے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک رنگ تھا لیکن ایک صبح جب لوگ نماز کے بعد مسجد سے باہر آرہے تھے تو انہیں یہ حقیقت جان کر یقین نہیں آیا کہ کل رات بجلی کے اہلکاروں نے پولیس کی موجودگی میں ماسٹر جی کے گھر پر چھاپہ ڈالا اور بجلی چوری کے بنا پر قانونی کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شاید یہ ان کی زندگی کا دوسرا رنگ تھا اور بستی والے اب تک اس رنگ سے ناواقف تھے۔

گھر سے گھر تک

ہم دونوں بھائیوں نے پوری رضامندی کے ساتھ الگ الگ رہنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ہمارے ایک گھر کے دو گھر بن گئے۔ بڑے بھائی پرانے مکان میں ہی رہنے پر بضد تھے اس لئے مجھے نئے تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ یہ مکان ہمارے پرانے مکان سے قریب قریب ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا۔ اب صرف اس بات کا فیصلہ ہونا تھا کہ دادا جان کس کے ساتھ رہیں گے اور ہمارا کتا ٹامی کس کے حصے میں آئے گا۔ بھائی جان نے دادا جان کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ ان کے دونوں بچوں کو دادا جان سے کافی لگاؤ تھا اور دادا جان بھی ان کو بہت چاہتے تھے اس لئے ٹامی میرے ساتھ نئے مکان میں آ گیا۔ اب ہم دونوں بھائی مطمئن تھے۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا، تیز بھاگتا رہا۔ ایک دن عجیب سی بات ہوگئی۔ صبح میں ٹامی کے ساتھ سیر کو نکلا۔ ٹامی کی گردن کی زنجیر میں نے ہاتھ میں تھامی تھی۔ اچانک ٹامی ایک دوسری سڑک کی جانب چلنے لگا۔ میں حیران ہوگیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ اس سڑک پر چل پڑا۔ تھوڑی دور چل کر گلی آ گئی۔ اس گلی پر مجھے ایک اولڈ ایج ہوم کا بورڈ دکھائی دیا۔ میں جب اولڈ ایج ہوم کے گیٹ کے پاس پہنچا تو وہاں آنگن میں کچھ افراد آپس میں گفتگو میں مصروف تھے۔ ٹامی اچانک اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کی طرف دوڑ پڑا۔ میرے ہاتھ سے اس کی زنجیر چھوٹ گئی۔ ٹامی ان میں سے ایک آدمی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے جب قریب سے اس آدمی کو دیکھا تو مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔۔۔وہ دادا جان تھے۔۔۔!

میں کون ہوں۔۔؟

اس وقت یہ کہنا میرے لئے مشکل ہے کہ یہ ادبی بددیانتی جان بوجھ کر کی گئی تھی یا ترتیب دیتے وقت لاشعوری طور پر مدیر کے ہاتھوں سے یہ غلطی سرزد ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ ''کائنات'' نامی جریدے میں میری تحریر کردہ کہانی میرے نام سے نہیں بلکہ احمد دلاور کے نام سے شائع ہوئی اور احمد دلاور کی تحریر کردہ کہانی میرے نام یعنی گل علی کے نام سے شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''کائنات'' گزشتہ ایک سال سے منظر عام پر آرہا ہے۔ اپنے تخلیقی معیار اور شاندار گٹ اپ کی وجہ سے ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہو چکا ہے۔ ہماری کہانیوں کے بدلاؤ نے ایک نئ کہانی کو جنم دیا۔ احمد دلاور کی کہانیوں میں ہمیشہ لب ورخسار کی باتیں ہوتی ہیں، گلابی ہونٹوں کی مہک بھری مسکراہٹوں کا ذکر ہوتا ہے، ان کے افسانوں میں جوان دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں، کانوں میں سریلی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔۔۔اگر میں کہوں کہ وہ جوان دلوں کی عکاسی اپنی کہانیوں میں بڑی خوبی سے کرتے ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کے برعکس میری کہانیوں یا افسانوں کے موضوعات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ میں اپنی کہانیوں میں انسان کی ڈوبتی نبض کی بات کرتا ہوں، خواتین اور بچوں کے تشدد پر لب کشائی کرتا ہوں ،معاشرے کی بدحالی اور انسانی الجھنوں کا ذکر کرتا ہوں۔ موجودہ پس منظر میں حالات وواقعات کی عکاسی میری کہانیوں میں بخوبی ملتی ہے اور ہاں میں کبھی کبھار اپنی کہانیوں میں سیاسی غفلت شعاری کی باتیں بھی چھیڑتا ہوں۔۔۔غرض ہم دونوں کی کہانیوں میں کوئی یکسانیت نہیں، موضوعات الگ الگ ہیں، انداز اور اسلوب الگ الگ

ہیں۔۔۔یہاں تک کہ ہماری سوچوں کے سمندر میں الگ الگ پانی بہتا ہے۔

احمد دلاور کی جو کہانی میرے نام سے شائع ہوئی جو جوان طبقے میں کافی پسند کی گئی اور اس نوجوان طبقے میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی بلکہ لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ان لڑکیوں نے دل کھول کر اپنے دل کی کہانی احمد دلاور کو سنانے کی کوشش کی تھی۔کئی لڑکیوں نے محبت بھرے انداز میں احمد دلاور سے دوستی بڑھانے کی بات کی تھی، یہاں تک کہ کئی لڑکیاں اس کے رومانی طرز اظہار پر اپنی راتوں کی نیند کھوچکی تھیں۔ان ساری باتوں کا انکشاف مجھے وہ خطوط پڑھ کر ہوا جو احمد دلاور کے نام مجھے یعنی گل علی کو ملے تھے اور اس کے برعکس میری کہانی دراصل احمد دلاور کی کہانی سمجھ کر نظر انداز کی گئی تھی کیونکہ اس میں نہ محبت کی مٹھاس تھی اور نہ سینے کے درد کی داستان، نہ تو زعفرانی پھولوں کی خوشبو تھی اور نہ ہی وفا یا بے وفائی کی کوئی دلیل۔میری کہانی میں زندگی کا جو درد چھپا تھا میں نے اس درد کو کہانی کے ایک ایک لفظ میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی اور اس بات کی جانب اشارہ بھی کیا تھا کہ اس درد کی تلاش کرنے میں ہماری نئی نسل ایک اہم کردار نبھا سکتی ہے۔شاید اس دور میں بھی وہ گلابی مسکراہٹیں تلاش کر رہے تھے۔

کہانی کے بدلاؤ سے میرے لئے ایک اور پریشانی کھڑی ہوگئی۔ان سارے خطوط کو ضائع کرنے کے بجائے میں نے انہیں ایک فائل کور میں سنبھال کر رکھا۔سوچا تھا کہ یہ سارے خطوط کسی ملاقات میں احمد دلاور کو پیش کروں گا لیکن ایک روز میرے ریڈنگ روم کی صفائی کرتے ہوئے یہ فائل میری بہو کی نظروں میں آ گئی۔اس نے سارے خطوط پڑھ لئے تھے اور ایک دن ڈنر لیتے ہوئے میری بہو نے اپنی ساس سے کہا:

"سنا ہے یہاں ایک اور بہو آنے والی ہے امی۔۔۔"

''بہواور یہاں۔۔!'' میری بیوی نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیا میرا اکلوتا بیٹا اور تمہارا سرتاج دوسری شادی کررہا ہے؟ کہاں ہے خالد۔؟''

'' وہ ابھی آرہے ہوں گے لیکن وہ ہرگز دوسری شادی نہیں کررہے ہیں۔۔۔شاید یہ دلہن خود ہی چل کر آجائے۔''

اس نے بات کا رخ میری طرف پھیر دیا۔

''بابو جی سے پوچھ لیتے ہیں''

میں خاموش رہا۔

''آپ خاموش کیوں ہیں۔۔؟ کچھ تو بولیے۔۔!''

''اب میں کیا بتاؤں۔۔۔جاؤ بہو میرے کمرے سے وہ فائل لے کر آؤ میں ساری کہانی دہراتا ہوں۔''

دوسرے دن میں نے وہ فائل ماہنامہ ''کائنات'' کے دفتر میں چھوڑ تو آیا لیکن من ہی من میں سوچتا رہا کہ میں کون ہوں؟۔۔۔!

جینے کی ہوس

بظاہر وہ نیک صورت اور نیک سیرت تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع تر ہو گیا تھا۔ دوستوں میں اگر وہ کسی سے دور رہنا چاہتے تھے تو وہ محمد سلیم تھے کیونکہ سلیم صاحب کو پینے کی بری عادت تھی۔ لیکن جب کرونا نے انہیں چھیڑنا شروع کیا تو کسی نئے اور انوکھی ڈھنگ سے اس بیماری سے چھٹکارا پانے کے لئے انہیں محمد سلیم یاد آ گئے۔

"آپ کے اتنے سارے دوست ہیں، ان میں سے آپ کو سلیم صاحب کی ہی ضرورت کیوں پڑی۔؟"۔۔۔ بیٹے نے پوچھا۔۔

"ضرورت پڑی تب ہی تو بلا رہا ہوں۔"

بیٹے نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ سلیم صاحب کو ان کہ یک طرفہ دوستی کو نظر انداز کرتے ہوئے حاضر ہوئے۔ بیٹے نے انہیں باپ کے کمرے تک رہنمائی کی۔

"بیٹے۔! اب تم جا سکتے ہو۔۔ مجھے اکیلے میں سلیم صاحب سے بات کرنے دو۔"

بیٹا بہت کچھ سوچتے ہوئے بھی کچھ نہ سوچ سکا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہاں سے چلا آیا۔۔

"سلیم صاحب۔۔!"

"ہاں کہیے احمد صاحب۔۔ آپ کی طبیعت ناساز لگتی ہے۔ آج کل کرونا سے بچنے کے لئے ہر ممکن احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔"

''جانتا ہوں۔۔اسی لئے تو آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی۔آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔میرے گلاس کو شراب سے بھر لیجیے۔۔''

''شراب اور آپ۔۔!''

''ہاں ہاں۔۔شاید آپ کی دوائی سے میری ذہنی اور جسمانی حالت میں بہتری آجائے۔میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔جینے کے لئے ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔بہت کچھ سوچنے کے بعد ہی آپ کو یاد کیا ہے۔''

''یہ تجربہ مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔میرا دل نہیں چاہتا۔۔''

''میری بات مان لیجیے سلیم صاحب۔۔''

سلیم صاحب کے بیگ میں ہمیشہ پینے پلانے کا بندوبست ہوتا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے سامنے پڑے گلاس میں شراب ڈال دی۔

''نہیں نہیں۔۔پانی میں خود ڈال دوں گا۔''

''پانی۔۔!''

''شکریہ!۔۔اب آپ جا سکتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد جب بیٹا باپ کو دیکھنے کے لئے کمرے میں آگیا تو وہ لیٹے پڑے تھے، انتہائی خاموشی کی حالت میں۔۔۔وہ گھبرا گیا۔۔۔اس کی آواز بے آواز ہوگئی۔گھر کے دوسرے افراد سے مشورہ کرکے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ڈاکٹر صاحب آگئے اور انہوں نے معائنہ کیا۔کمرے میں ایک عجیب سی بو محسوس کرکے وہ حیران رہ گئے۔انہوں نے سامنے تپائی پر رکھے گلاس خالی گلاس کو ہاتھ میں تھام کر اسے دو تین بار سونگھنے کے بعد کہا:

''کیا یہ شراب پیتے ہیں۔؟''

''نہیں تو۔۔کبھی نہیں۔۔''

''صورت سے تو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن شاید ذہنی تناؤ کو دور کرنے کے لئے انہوں نے شراب کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ بے ہوش ہو چکے ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا یہ کوما میں چلے گئے ہیں۔ ہوش میں آنے کی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔''

''تو کیا ڈاکٹر صاحب۔!'' بیٹے نے گھبراتے ہوئے کہا لیکن وہ اپنی بات مکمل نہ کہہ سکا۔

''دنیا سے ہم سب کو جانا ہے لیکن گلاس کی بو سے لگتا ہے کہ یہ جاتے جاتے دین سے بھی گئے۔۔۔اللہ رحم کرے۔۔!''

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر کمرے سے باہر آ گئے۔۔۔

پہچان

وہ گھر بستی میں ماسٹر جی کے گھر سے جانا اور پہچانا جاتا تھا اور ماسٹر جی کا یہ گھرانہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ ماسٹر الطاف احمد، ان کی بیگم آمنہ بانو اور اکلوتا بیٹا عارف۔ الطاف صاحب اور آمنہ بانو شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھے اور ایک مقامی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ اپنے بیٹے کو پڑھانا لکھانا اور کسی قابل بنا دینا ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو رہے تھے۔ کمپوٹر انجینئرنگ میں ماسٹرس ڈگری حاصل کرنے کے بعد عارف کو ایک مقامی انجینئرنگ فرم میں ملازمت بھی مل گئی۔ فرم کا چیف ایگزیکیٹو عارف کے کام سے بے حد مطمئن تھا اور اس کی ترقی کا خواں بھی۔

ایک دن انہوں عارف کو چیمبر میں بلا کر بڑے اطمینان سے کہا "دیکھو عارف میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرو لیکن یہاں رہ کر شاید ایسا ممکن نہیں۔ نیوزی لینڈ میں میرے چند دوست ہیں جو کمپوٹر انجینئرنگ کے تعلق سے کام کرتے ہیں، تم اگر چاہو تو میں ان سے بات کرسکتا ہوں۔ تمہیں اچھی جاب مل سکتی ہے اور اچھی خاصی سیلری کے علاوہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے پرسکون فضاء مل سکتی ہے۔"

"لیکن میرے ابو اور میری امی۔۔۔"

"یہ میرا مشورہ ہے۔۔۔ فیصلہ لینے کا حق تمہارا اپنا ہے۔"

عارف نے اپنے امی ابو سے بات کی۔ وہ بولتا رہا اور وہ دونوں خاموشی سے

سنتے رہے اور اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی سوچوں میں بیٹے کے مستقبل کی چھوٹی بڑی کرنیں جگمگانے لگ گئیں اور وہ ان دیکھے خوابوں کی ایک نئی دنیا پھولوں کی مسکراہٹوں سے سجانے لگے۔

اور وہ نیوزی لینڈ چلا گیا۔۔

نئی دنیا، نئی زندگی اور نیا ماحول۔۔۔!

نئی دنیا کی نئی فضاؤں اور ہواؤں میں گھر کی یادیں اس کے ذہن کو گھیرتی رہی۔ والدین کی شفقت اور محبت آنکھوں کو پرنم بناتی رہی، بچپن اور لڑکپن کے دوستوں کی شرارتیں یاد آتی رہی لیکن جب ایڈنی نے اس کی زندگی میں دلچسپی لینی شروع کی تو یادوں کے راستے تنگ ہونے لگے، پرنم آنکھیں مسکرانے لگیں۔ ایڈنی اس فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی تھی جہاں اس نے ملازمت اختیار کی تھی۔ محبت کی راہوں میں پھول کھلتے رہے۔ ان پھولوں کی مہک میں ان کی دوریاں نزدیکیوں میں بدل گئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ اپنانے اور ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔۔

وقت کا دریا بہتا رہا۔۔

والدین۔۔۔امی اور ابو کی تصویریں دھندلی ہوکر عارف کی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ ایڈنی کا باپ کار حادثہ میں اپنی زندگی کھو بیٹھا اور اس کی ساری جائیداد ایڈنی کے نام منتقل ہوگئی۔ عارف فرم کا چیف ایکزیکیٹو بن گیا اور ایک نیا سنہری دور اس کی زندگی کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

پرانے رشتے ٹوٹ چکے تھے اور نئے رشتے وجود میں آچکے تھے۔ پرانے رشتوں کی کھٹی میٹھی ان گنت باتیں نئی رشتوں کی تہہ میں پوشیدہ ہوچکی تھیں۔ پرانے رشتوں کی پہچان نئے رشتوں میں بدل چکی تھی۔

اب عارف کو نیوزی لینڈ میں رہتے ہوئے دس برس بیت چکے تھے۔اس کی فرم کے بزنس نے ایک بڑا سادائرہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ایڈنی اور عارف کے دونوں بچے اپنی تعلیمی زندگی کو سنوارنے میں مصروف تھے۔

اور ادھر۔۔امی اور ابو۔۔۔۔۔۔عارف کے والدین نوکری سے کب کے سبکدوش ہو چکے تھے۔ان کا اپنے بیٹے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔پہلے کبھی کبھار فون سے بات ہوتی تھی اب وہ سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ان کی گزر بسران کی پنشن تک محدود تھی۔

اور پھر ایک صبح نماز فجر کے بعد امام صاحب نے مسجد میں میں کہا کہ وہ کئی دن سے دیکھ رہے ہیں کہ ماسٹر جی کے گھر کے بیرونی دروازے پر تالا چڑھا ہوا ہے اور اندر باہر کسی آہٹ کے آثار بھی نہیں۔اس خبر سے بستی میں ایک درد بھری کہانی نے جنم لیا اور یہ درد بھری کہانی اخبارات کی سرخیوں میں بھی نظر آنے لگی۔پولیس اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے سامنے آگئی۔مختلف تفصیلات حاصل کرنے کے بعد پولیس نے عارف سے رابطہ کیا۔عارف نے اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے آنے سے معذری ظاہر کی لیکن اس بات کا یقین دلایا کہ اطلاعات فراہم کرنے والے کو معقول انعام دیا جائے گا۔انعام حاصل کرنے کی غرض سے ہر سطح پر شدت آنے لگی۔

لیکن سب بے سود۔۔۔۔

اور پھر دو ماہ بعد پولیس کو دریائے جہلم کے سینے پر دو لاشیں دکھائی دی۔۔

ایک مرد اور ایک خاتون کی۔۔۔

ان کی پہچان نہ ہو سکی۔۔۔اور بے نام قبرستان میں دفنا دی گئیں۔۔۔۔

انمول تحفہ

رمضان مبارک کا پہلا روزہ۔۔۔!

پہلی برکت۔۔۔!!

ابھی ابھی شام نماز سے فارغ ہونے کے بعد رقیہ بہو کھانے کے لئے دستران خوان سجانے لگی۔حاجی احمد علی کے آنے کے ساتھ ہی دوسرے افراد خانہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دستران خوان کے اردگرد بیٹھ گئے۔رقیہ بہو کھانا ڈالنے لگی کہ باہر سے ایک آواز سنائی دی۔

''بابا تھوڑسا کھانا دیجیے۔۔اللہ روزوں کی برکت سے نوازے گا۔''

نوکر جانے لگا لیکن حاجی صاحب نے روک لیا۔

''رزاق تم بہو بیٹی کی مدد کرو میں خود دیکھ آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے حاجی کمرے سے باہر آگئے اور باہر بڑے دروازے کے قریب ایک بوڑھا فقیر کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے۔؟''

''تھوڑا سا کھانا دیجیے، میرے پاس کھانا تو ہے لیکن ٹھنڈا ہو چکا ہے، روزہ رکھا تھا۔۔۔ٹھنڈا کھانا ہضم نہ ہوگا۔''

''رک جایئے۔''

حاجی صاحب اندر آگئے۔اتنی دیر میں بہو بیٹی کھانا پروس چکی تھی۔انہوں نے ایک ہاتھ میں پلاؤ اور مرغ سے بھرا پلیٹ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ایک خالی پلیٹ ،اور باہر آگئی۔فقیر کا ٹھنڈا کھانا خالی پلیٹ میں ڈال دیا اور اپنا گرم گرم کھانا فقیر کے

ڈبے میں ڈال دیا۔

"جاؤ اللہ رحم کرے گا۔"

حاجی صاحب اندر آ گئے، اپنی جگہ سنبھالی اور فقیر کا ٹھنڈا کھانا کھانے لگے۔

"پاپا۔۔۔آپ اور یہ کھانا۔۔۔میں آپ کے لئے کھانا پروس چکی ہوں لیجیے۔"

"نہیں بٹیا۔۔فقیر کا یہ ٹھنڈا کھانا میرے لئے روزوں کا ایک انمول تحفہ ہے۔"۔۔۔!

کہانی کا المیہ

اپنی نئی کہانی کے کرداروں کے خدوخال سنوارتے سنوارتے مجھے بے حد پیاس کا احساس ہو رہا ہے۔

کیا میں واقعی پیاسا ہوں۔۔؟

کیا پانی پینے سے میری پیاس بجھ سکتی ہے۔؟

شاید نہیں۔۔۔دراصل پیاسا میں نہیں بلکہ میری کہانی کے کردار پیاسے ہیں لیکن سوچتا ہوں کہ ان کی پیاس سے پانی کا کیا تعلق۔۔؟ یہ تو جسمانی پیاس ہے، بدن سے ابھرنے والی سروں کی پیاس ہے، ہونٹوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ کی پیاس ہے، آنکھوں میں بارش کی نمی کی پیاس ہے، دل کی دھڑکنوں میں محبت کی چاشنی کی پیاس ہے۔

اور پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ پیاس بھوک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔شاید اس لئے کہ پیاس کی طرح بھوک کے بھی بہت سارے رنگ ہیں، بہت سارے انداز ہیں اور بہت سارے زاویے ہیں۔

جب پیاس اور بھوک ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں، ایک دوسرے کا دامن تھام لیتے ہیں تو انسانیت کے لباس میں پوشیدہ کہانی حیوانیت کے لباس میں باہر آتی ہے اور کہانی کو ڈس لیتی ہے۔یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب کہانی کار کا قلم لکھتے لکھتے رک جاتا ہے، بے حس اور بے بس ہو کر انگلیوں میں تھم جاتا ہے۔۔

میرا قلم اب میری انگلیوں میں کہانی لکھتے لکھتے بے حرکت ہو چکا ہے اور اس

بے حرکت لمحے میں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں بلکہ میں نہیں میرا کہانی کار بتانا چاہتا ہے۔دراصل اس کہانی کے کردار بھوکے ہیں اور نہ ہی پیاسے بلکہ یہ میرے اندر چھپا ہوا کہانی کار پیاسا ہے اور بھوکا بھی۔اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ میں الجھ کر ذہنی لطافت کھونا چاہتا ہے۔کاغذی کرداروں کو اپنی سوچوں کی راہ ہموار کر کے اپنے من پسند انداز میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ان کرداروں کو مختلف روپ دے کر ہر روپ کو اپنی نظر اور اپنی پسند سے دیکھنا چاہتا ہے،مختلف انداز سے لفظوں کی تپش میں گم کر دینا چاہتا ہے لیکن یہ کردار نہ تو بولتے ہیں اور نہ ہی سوچتے ہیں،ان کے نہ جذبات ہیں اور نہ ہی احساسات۔۔یہ کردار تو گونگے ہیں،بہرے ہیں ،زندگی کی روشنی سے محروم ہیں۔۔۔!

پھر ان کی کیسی پیاس۔۔کیسی بھوک۔۔؟

میرا قلم ان کاغذی کرداروں کو زندگی کی سانسوں سے آشنا کرتے کرتے اب تھک چکا ہے لیکن کیا کروں میں سب کچھ جاننے اور پہچاننے کے بعد پیاسا ہوں، بھوکا ہوں۔۔!

یہ میرے اندر کے کہانی کار کی کہانی کا المیہ بھی ہوسکتا ہے۔

کارنیک

''صوفیہ! تم اور یہاں اس وقت۔۔ تمہیں تو اس وقت دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں ہونا چاہیے تھا پر کیا کروں سپیشل ڈیوٹی پر یہاں آئی ہوں۔''

''سپیشل ڈیوٹی۔۔ مذاق کر رہی ہو۔۔۔ کہو کیسے آنا ہوا۔ تمہارے لئے کافی بناؤں۔۔؟''

''نہیں''

''فاروق تو کب کے دفتر چلے گئے۔''

''ہاں جانتی ہوں۔۔۔ وہ میرے باس ہیں اور میں ان کی دفتری مصروفیات سے بخوبی واقف ہوں۔''

''پھر during office hours کیسے آنے دیا تمہارے باس نے۔؟''

''کارنیک کے لئے''

''کیا مطلب۔۔؟''

''میں نے کہا نا میں یہاں سپیشل ڈیوٹی پر آئی ہوں۔ اب تم میرے ساتھ باہر چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔۔''

''لیکن جانا کہاں ہے۔؟ لگتا ہے کسی ریسٹورنٹ میں تم مجھے گرم گرم ہریسہ کھلانا چاہتی ہو۔''

''نہیں ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔''

''تو پھر جانا کہاں ہے۔ کچھ تو کہو۔۔''

''ہاسپٹل''

''ہاسپٹل۔۔! کیوں؟ کس لئے؟''

''تمہارے فاروق اور اپنے باس فاروق صاحب کے حکم سے۔''

''تمہیں باس نے کہا یہاں آنے کے لئے۔۔؟''

''جی ہاں فاروق صاحب نے ہی کہا ہے۔ وہ خود آنا چاہتے تھے لیکن انہیں ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے رکنا پڑا۔ آخر میں ان کی سکریٹری ہوں، مجھے آنا ہی پڑا۔ اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ ہاسپٹل کیوں جانا ہے۔ تم دونوں کی زندگی میں جو نیا مہمان آنے والا ہے اس کی سلامتی کے لئے HIV ٹیسٹ کرانے کے لئے تمہیں ہاسپٹل لے کر جا رہی ہوں۔ یہ میرے باس کا حکم ہے۔ سپیشل ڈیوٹی۔۔۔۔

سوداگر

وہ پڑھا لکھا تھا، تعلیم کے نور سے آراستہ تھا مگر بے روزگار۔۔۔؟ وہ روزگار کی تلاش کرتا رہا، دستک پر دستک دیتا رہا مگر اس کے لئے شاید روزگار کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ان بند دروازوں کے اندر باہر اس کے لئے مایوسی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

اور پھر۔۔۔!

سوسائٹی کے ایک معتبر شخصیت نے روپیہ پیسہ کمانے کے لئے اس کے لئے ایک نئی اور انوکھی راہ ہموار کرلی اور وہ اس پر بغیر سوچے سمجھے چل پڑا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کرنے لگا اور چھوٹے بڑے عوامی جلسوں میں ان پھتروں سے لوگوں کو لہولہان کرنے لگا۔ امن وسکوں کی فضاؤں کو بے رنگ کرنے لگا، پیار ومحبت کے گلستانوں کو ان کی مہک سے محروم کرنے لگا اور اس طرح انسانی خون سڑکوں پر بہتا رہا ،جسم بکھرتے رہے۔ انسانی خون سے وہ روپیہ پیسہ کماتا رہا اور بری عادتوں سے اپنی زندگی، مستقبل اور مستقبل کی خوشیوں کو اندھیروں کی جانب دھکیلتا گیا۔

اور پھر ایک دن پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اس کا شاندار اور سجا سنورا مستقبل جیل کی کہانی میں ہمیشہ کے لئے سمٹ گیا۔

اور وہ سوگرا۔۔۔۔ پتھروں کا سوداگر ایک بار پھر یہ کہانی دہرانے میں مصروف ہو گیا۔۔۔!

رشوت

کارپوریشن کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد انہوں نے اپنے سٹاف کی پہلی نشست میں زوردار الفاظ میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ میں رشوت کے سخت خلاف ہوں۔ میں نے کبھی نہ رشوت لی ہے اور نہ ہی دی ہے۔ رشوت لینے دینے کے تعلق سے اگر کوئی شکایت منظر عام پر آتی ہے تو میں قانونی کاروائی کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔

نشست کے بعد جب وہ اپنے چیمبر میں آیا تو اس کے سامنے کھڑا شخص شکایت بھرے لہجے میں التجا کر رہا تھا۔۔۔

"جناب میرے بیٹے کو نوکری دلانے کی عوض آپ نے مجھ سے ایک اچھی خاصی رقم لی تھی۔۔۔اس کا کیا ہوگا۔۔۔؟"

ایک لمبی رات کی کہانی

یوں تو اس دنیا کی ہر شئے فانی ہے مگر انسانی زندگی اس فانی دنیا کو کسی بھی ان دیکھے ان جانے لمحے میں کوئی صدا، کوئی آواز سنے بغیر ہی اپنی سانسوں سے محروم ہو سکتی ہے اور جب سے کرونا نامی وائرس نے انسانی زندگی کے دروازے پر دستک دی ہے، بے آواز قدموں سے انسانی وجود ہی سمٹ گیا ہے اور تب سے انسانی سوچیں ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے گلستان نامی اس پسماندہ اور دور دراز پہاڑی بستی کے مکینوں کے ذہنوں میں انتشار انگڑائیاں لینے لگا ہے۔ خوف و ہراس کے اس غیر دلچسپ ماحول میں جب چودھری اسحاق علی کی معتبر و معزز شخصیت مسجد شریف کے آنگن میں نمودار ہوئی تو وہاں موجود لوگوں کی اداس اداس سی آنکھوں میں جیسے مسرت کی دھیمی رمق نظر آنے لگی اور ماحول میں خاموشی چھا گئی اور پھر اس خاموشی کو چیرتے ہوئے چودھری اسحاق علی کی گرجدار آواز سنائی دی۔

''کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو خاموش کیوں ہو گئے ہو۔؟ میں چودھری اسحاق علی ہوں کرونا وائرس نہیں۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جس کرونا نامی وائرس نے تمہارے ذہنوں کو مفلوج کر رکھا ہے، تمہاری سوچوں میں انتشار پیدا کر رکھا ہے، تمہاری جسمانی قوت کو بے حس کر دیا ہے، تمہاری ہنسی، خوشی اور مسرتیں چھین لی ہیں ۔۔۔۔۔ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس وائرس کا کوئی وجود ہوتا تو کیا اب تک ہماری بستی اس کی زد میں نہیں آئی ہوتی۔ مجھے تو یہ سیاسی جادوگرنی اپنا ناچ نچاتی نظر آ رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کب تک ناچ نچاتی رہے گی۔۔''

اسی دوران اذان کی مدھر مدھر اور خوش کن آواز مسجد کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ لوگ آہستہ آہستہ قدموں سے بے حد احترام کے ساتھ مسجد کے اندر جانے لگے۔ نماز کے بعد ان کی خاموش خاموش قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

اور پھر ایک طویل رات کے بعد صبح نمودار ہوئی لیکن اس طویل رات کے بے شماران گنت لمحوں میں ایک نئ کہانی جنم لے چکی تھی۔۔۔ چودھری اسحاق علی مسجد میں نظر نہیں آرہے تھے۔ ان کی سانسیں ہمیشہ کے لئے کرونا وائرس کی نظر ہو چکی تھیں۔۔۔

رشتے جانے پہچانے

نہ جانے کیوں، کیسے اور کیا سوچ کر غلام صفدر نے دو مکان بنوائے تھے۔ ایک اپنی پرانی بستی میں جہاں وہ پیدا ہوا تھا، پروان چڑھا تھا، گھر بسایا تھا اور زندگی کے بہت سارے گرما سرما دیکھنے کے بعد اس بستی کی مٹی کو اپنا لیا تھا۔ دوسرا مکان بستی سے قریب قریب چار کلومیٹر کی دوری پر ایک دوسری بستی میں جو نئے طرز پر تعمیر کے ساتھ وجود میں لائی گئی تھی۔

صفدر صاحب کی وفات کے کچھ ہی دیر بعد مشترکہ گھرانے کی روایت ٹوٹنے لگی اور دونوں بھائیوں نے الگ الگ گھر بسانے اور گھریلو زندگی کو اپنی مرضی سے سجانے، سنوارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑے بھائی نے پرانے مکان میں رہنے کو ترجیح دی کیوں کہ ماں اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس گھر کے در و دیواروں میں اس کی ان گنت یادیں محفوظ تھیں، اس کا ماضی پوشیدہ تھا۔ چھوٹا بھائی اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ نئے مکان میں منتقل ہو گیا لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد بڑی بہو نے اپنی ساس کے سامنے تیکھے تیور دکھانے شروع کئے اور جب بات برداشت سے باہر ہو گئی تو ماں نے چھوٹے بیٹے کے گھر میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ چھوٹے بیٹے کے گھر میں خوشگوار اور پرسکون ماحول میں دن گزرنے لگے لیکن پھر نہ جانے کیوں چھوٹی بہو کے تیور بھی بدلنے لگے۔ اس کی باتوں میں کڑواہٹ آئی اور وہ ہر بات پر اپنی ساس سے جھگڑنے لگی مگر ماں خاموش رہی اور اسی خاموشی میں اس نے اپنے لئے تیسرے راستے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر اولڈ ایج ہوم میں پناہ لی۔ وقت کا

پہیہ کبھی سست تو کبھی تیز رفتاری سے بھاگتا رہا، دوڑتا رہا۔۔۔

جب وقت کا پہیہ ذرا سا تھم گیا تو دونوں گھرانوں میں دو الگ الگ عورتیں نظر آنے لگیں۔۔۔ بڑے بھائی کے گھر میں اس کی بیوی کی ماں۔۔۔ اور۔۔۔ چھوٹے بھائی کے گھر میں اس کی بیوی کی ماں۔۔۔!

گھر گھر پانی

وہ جل شکتی مشن کا ایک اہم رکن تھا اور دفتری مصروفیات کی وجہ سے کئی دن تک گھر نہیں جا پاتا تھا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن اپنے ہی گاؤں میں اپنے ہی گھر میں قیام پذیر تھے۔ ان کے گاؤں میں پانی کی فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو بے حد مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دو کلومیٹر دور پانی لانے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ آج جب وہ حسب معمول دفتری کاغذات دیکھنے میں مصروف تھا تو ایک انجانی سی خوشی اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی، وہ بے حد خوش ہوا۔ اس کے گاؤں میں سرکاری سطح پر زر کثیر خرچ کرنے کے بعد پانی میسر آیا تھا۔ دو کلومیٹر کی دوری دو قدموں میں سمٹ چکی تھی۔ وقت کا لمحہ بھاگتا رہا اور جب دو ماہ بعد اسے اپنے گاؤں، اپنے گھر جانے کا موقع ملا تو وہ یہ جان کر حیران ہوا اور پریشان بھی کہ گاؤں میں نہ تو نل دکھائی دے رہا ہے اور نہ ہی جل۔۔

اور۔۔اور۔۔!

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ریشی صاحب نے انتخاب میں جیت حاصل کر کے شہری کمیٹی کی صدارت کا عہدہ سنبھالا اوراس کے ساتھ ہی پالتھین اوراس کے استعمال کے خلاف ایک زورعوامی بیداری کی مہم کا آغاز ہوا۔اس مہم کی کامیابی میں عوامی سطح پر پورا تعاون حاصل ہوا۔مقامی پولیس اوراخباری حلقے بھی اس مہم کا ایک حصہ بنے رہے۔

ریشی صاحب دوسال کے لئے صدر بنے تھےاوردوسال کا عرصہ یوں گزرگیا کہ احساس تک نہ ہوسکا۔شہری کمیٹی کے نئے انتخابات عمل میں لائے گئےاوردلدار صاحب نے جیت حاصل کر کے صدارت کی کرسی سنبھال لی۔ریشی صاحب نے اپنی اعلی کارکردگی کی وجہ سے جومقبولیت حاصل کی تھی اس کوکم کرنے کی خاطر دلدار صاحب نے پرانے منصوبوں کے بجائے نئے منصوبوں میں دلچسپی لیناشروع کردی اورسب سے پہلے بے ورزگاری کا مسئلہ چھیڑا۔انہوں نے شہر کے بے روزگاروں سے ملناشروع کیا۔بے روزگارلوگ انفرادی اوراجتماعی طورپرآتے رہے، ملتے رہے اورجاتے رہے۔۔

ایک صبح جب دلدار صاحب ناشتہ کر کے اخبار بینی میں مصروف تھے کہ بے روزگارافراد کاایک وفدان سے ملنے ان کے گھرآیا۔اس وفد میں صرف وہ لوگ تھے جن کا تعلق پالتھین کی خرید وفروخت اورفراہمی سے تھا۔وہ چاہتے تھے کہ ان کے لئے بھی روزگار کے وسائل پیدا کئے جائیں۔دلدارصاحب کی مفصل گفتگو سے وہ

مطمئن نظر آرہے تھے۔دلدار صاحب نے پالیتھین کی خرید وفروخت اور آسان فراہمی کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔انہوں نے متعلقہ افراد کومقررہ تاریخ پر دفتر آنے کے لئے کہا۔۔

وفد میں شامل لوگ خاموشی سے ان کے گھر سے لوٹ آئے۔۔

اور پھر چند روز بعد وقت مقررہ پر وہ شہری کمیٹی کے دفتر میں حاضر ہوئے اور جب دلدار صاحب ان سے ملنے اپنے کمرے سے باہر آئے تو حیران رہ گئے۔ ہر فرد کے ہاتھ میں ایک بینر تھا اوران بینرز پر لکھا تھا:۔

بے روزگاروں کو روزگار دو۔۔!

پالی تھین کے استعمال پر پابندی لگانے کے لئے قانون پاس کیا جائے۔۔

شہری کثافت کے خلاف آواز بلند کرو۔۔

اور۔۔۔

اورشہری کثافت پھیلانے والوں کوشہری کمیٹی سے باہر کرو۔۔۔۔

اور۔۔۔اور۔۔۔۔!

اپنا اپنا مقدر

اور پھر فرش زریں پر خون کے قطرے بکھر گئے اور ہر سمت ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ شور و غل، چیخیں، شکوے، شکایتیں، خون بہنے کا یہ حادثہ سب کی نظروں میں بڑا دلدوز تھا لیکن وہاں موجود ان گنت لوگوں کو مجھ سے شکایت تھی، میری بے حسی اور میری خاموشی پر۔ وہ سب شاید اس بات سے بے خبر تھے کہ میری بے حسی اور خاموشی کی تہہ میں ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ وہ دن اب بھی مجھ یاد ہے، وہ لمحہ اب بھی میری سوچوں میں محفوظ تھا۔ ایسے ہی، اسی طرح، اسی صورت حال میں، اسی فرش زریں پر میرا بھی خون بہا تھا جسے سب نے دیکھا تھا۔ خون بہنے کا وہ حادثہ بھی بڑا دلدوز تھا لیکن نہ کوئی آواز ابھری تھی نہ ہی کوئی ہنگامہ ہوا تھا۔۔۔۔شاید میرا خون بے رنگ تھا۔

بے نام

''آپ کا نام؟۔۔''

''دلربا''

''خوبصورت نام ہے۔''

''شکریہ۔۔''

''یہاں کام کرنے کے دوران آپ کو اپنوں، غیروں یا اجنبیوں سے ملنے جلنے میں اعتراض تو نہیں۔''

''بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''رقص و مستی سے کوئی لگاؤ۔۔کوئی دلچسپی۔؟''

''جی ہاں کسی حد تک۔۔''

''شعر و شاعری۔۔؟''

''عشق و محبت کے بہت سارے اشعار ذہن میں محفوظ ہیں۔''

''پینے پلانے۔۔؟ خیر یہ بات جانے دیجیے۔۔''

''ویسے انکار نہیں کروں گی۔''

''لینے دینے میں کوئی جھجک۔۔؟''

''اس کا فیصلہ وقت پر ہی چھوڑ دیجیے۔۔''

''بہت خوب۔۔ بڑی خوشی ہوئی۔۔اور۔۔''

''اور کیا۔۔؟''

''آج سے آپ ہماری کمپنی کی نئ پبلک ریلیشن آفیسر ہیں۔آپ کے آنے سے ہماری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔۔''

کل آج اور کل

اس گھر میں محبتیں اور شفقتیں تھیں۔ پیار و محبت کی ایک چھوٹی سی کائنات آباد تھی۔ تین ہی افراد تھے اس گھر کے، باپ، ماں اور بیٹا۔۔ان کے رشتوں میں اتنی قربت تھی کہ ایک دوسرے کی سانسوں کی خوشبو پہچان لیتے تھے۔دل کی کھڑکی کھلتے ہی وہ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات سے واقف ہوجاتے تھے۔پھر یہ تین سے چار ہوگئے، بیٹے کی شادی ہوگئی، گھر میں بہو آگئی اور ایسا دکھائی دینے لگا جیسے آکاش کی بلندیوں سے چاند تارے ان کے گھر میں اتر کر ایک نگینے میں سمٹ گئے ہوں۔باپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں اس کے اندر پوشیدہ محبت کی عکاسی کرتی رہی اور ماں کے دامن سے والہانہ پیار ابھرتا رہا۔ پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں اور چھوٹی چھوٹی محبت بھری کہانیاں گھر کے گوشوں میں رقص کرتی رہی۔بیٹے کا والدین کے تئیں بے پناہ، بے انداز لذت آمیز خوشیوں اور مسرتوں کا انمول خزانہ حسب معمول جگمگاتا رہا۔بہو کے آنے سے گھر میں رونق سی آگئی،ایک نئی روشی پھوٹ پڑی۔ان کے بیٹے اور بہو کی آپسی محبت میں نکھار آتا رہا،ان دیکھے خوابوں کی دنیا سجتی سنورتی رہی جیسے گلاب اور اس کی مہک، جیسے تتلی اور پھول کا آپسی لگاؤ اور قربت ایک دوسرے کے بغیر ناممکن۔۔۔!

یہ تھی اس گھر کے کل کی بات۔۔۔

اور بتادوں آج کی بات۔۔۔

راکھ کے ڈھیر پہ ابھرے ہوئے ساس بہو کے جھگڑے۔۔۔!

ان کہی بات

"آپ کے شہر آنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے کہ بہت ہی خوبصورت ہے آپ کا شہر۔ بلکہ جھیل، جھروں، کوہساروں اور آبشاروں کی دھرتی ہے، چاند تاروں کی زمیں ہے، برف پوش پہاڑوں کا بسیرا ہے۔" ناظم نے حسب معمول فون پر ناشاد سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔۔

"تو آیئے نا۔۔!" ناشاد نے یہ کہتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے ناشاد بھائی۔۔؟"

"وہ اس لئے کہ آپ نہیں جانتے کہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔۔ کیا آپ وہ دیکھ سکیں گے،،؟"

"وہ کیا۔۔؟"

"میری اس بستی کا محشر۔۔!"

محبت کی دوسری کہانی

دل کی چاہت جب لفظ لفظ بن کر ہونٹوں پر آتی ہے تو چہرے کے گلاب کھلے کھلے سے کھلتے ہیں، سوچیں ایک نیا انداز اپنا کر رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اڑان بھرنے لگتی ہیں شاید ان سوچوں کی دل کی چاہت سے بہت قربت ہے، شاید بہت زیادہ نزدیکی ہے۔تب ہی تو ان میں ایک سوچ تتلی بن کر عذرا کے روپ میں میری نظروں میں سمٹ جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں عذرا صرف ایک تصور ہے، ایک خوبصورت تصور اور اس تصور کے پس منظر میں ایک لڑکی ہے ایک سیدھی سادی سی لڑکی۔جس کے حسن میں تازگی ہے اور سوچوں میں صبح کی ہواؤں کے بانکپن کے ساتھ ساتھ سادگی بجی پوشیدہ ہے۔اس کے انداز گفتگو میں کوئی الجھاؤ نہیں، کوئی تیکھا پن نہیں بلکہ سادگی کا حسن جگمگاتا ہے اور پھر کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ عذرا تتلی بھی نہیں ہے کیونکہ تتلی رنگ برنگی پھولوں کا رس نچوڑتی ہے، ان کی خوشبو چراتی ہے، ہر اڑان کے ساتھ اپنی پسند بدلتی ہے۔۔اس پس منظر میں ایک سوال ابھرتا ہے۔۔۔

''کیا میں بھی عذرا کی پسند ہوں۔۔؟اس کی چاہت اور اس کی سوچ میں ہوں۔۔؟ میری سوچ کہیں بے برسے بادل کی گونج تو نہیں جس کی گرج جب کانوں میں سنائی دیتی ہے تو سوچیں ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔۔۔!''

جی ہاں میں اس عذرا کی بات کر رہا ہوں جسے میں نے پہلی بار ''سٹار انٹرنیشنل کارپوریشن'' کے دفتر میں دیکھا تھا۔کارپوریشن میں تعیناتی کے بعد اسے انجینئرنگ ونگ میں کام کرنے کو کہا گیا تھا۔یہاں اختر اور نادر پہلے ہی میرے ساتھ کام کرتے

تھے۔عذرا کے آنے ہمارے دفتری کلچر میں ایک اور چہرہ نظر آنے لگا۔ مجھے پہلی بار لگا کہ اس کے چہرے کی تازگی میں سادگی کچھ اس انداز کی تھی کہ ہمارے دفتری کلچر کی رنگ برنگی میں بھی ایک سادگی نظر آنے لگی، خلوص بھری سادگی، محبت بھری سادگی، ایک ایسی سادگی جو صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔

پھر اچانک وقت کا پہیہ حسرت وتمنا کی ٹیڑھی میڑھی راہوں سے گزرتے گزرتے ایک انجانے موڑ پر خواب وخیال کی ایک ان دیکھی دنیا بساتے بساتے رک سا گیا۔عذرا کے لیپ ٹاپ میں جانے کیا ہوا۔؟ ٹھک کرتے کرتے ہماری انگلیاں ایک دوسرے سے چھوگئیں، پھر ہماری نظریں ملیں اور ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرگئی اور یہی مسکراہٹ ہماری قربت کی بنیاد بن گئی۔

یوں تو میں اپنے سیکشن مین سینئر تھا اور اس ناتے ہیڈ بھی لیکن ہمارے کام کرنے کا اندازا کچھ اس ڈھنگ کا تھا کہ ہم ایک جیسے لگتے تھے۔ ہر کوئی نہ صرف اپنی بلکہ ایک دوسرے کی ذمہ داریوں سے واقف تھا جس کے نتیجے میں ہمیں کام کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آرہی تھی۔ دفتر کی دوستی، دفتر کی باتیں ۔۔۔اس میں الگ ایک اپنا پن تھا لیکن دفتر سے باہر میں اور عذرا مل کر ایک خوبصورت گھر کی تعمیر کا خواب دیکھتے دیکھتے سوچوں کی یکسانیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اور پھر یوں ہوا کہ کارپوریشن کے پبلسٹی ونگ کے ہیڈ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ان کی جگہ میرا تبادلہ ہوگیا، مجھے جانا پڑا۔عذرا اور میری قربت میں ظاہری طور پر دوری تو دکھائی دینے لگی لیکن یہ دوری ہمیں ہرگز محسوس نہ ہوئی۔ کہتے ہیں کہ دوریوں میں محبت کی شدت کا کچھ زیادہ احساس ہوتا ہے۔ہم دونوں کی کوشش رہتی کہ دفتر سے باہر اپنی اپنی محبت کو ایک دوسرے کے آغوش میں چھپالیں، محبت پروان چڑھتی رہی، محبت کی آغوش کا دائرہ بڑھتا گیا۔اسی دوران کارپوریشن کے باس نے

ہم دونوں کو اپنے چیمبر میں بلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔۔

''میں نے تم لوگوں کو اس لئے بلایا کہ اب تمہاری محبت کی داستان کارپوریشن کے در ودیوار پر نظر آنے لگی ہے۔میں اب اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔اگر تم واقعی ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو شادی کرلو، میں تمہارا کا ساتھ دوں گا۔اب یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔تم بہت اچھا کام کرتے ہو، میں تمہارے کام سے مطمئن ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ مجھے کارپوریشن کے قواعد کی جانب دیکھنا پڑے۔۔!''

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے اور سر نے اشارہ کر کے ہمیں جانے کو کہا۔ہم نے ان کی جانب دیکھا اور خاموشی سے باہر آ گئے اور ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا لیکن چند ہی دنوں بعد ایک عجیب سا واقعی پیش آیا۔عذرا کی بڑی بہن ایک حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھی اور اپنے پیچھے دو معصوم بچیوں کو چھوڑ گئی، جن میں ایک کی عمر تین سال اور دوسری کی پانچ سال تھی۔عذرا چھٹی لے کر گھر گئی اور کافی دنوں کے بعد واپس آ گئی۔وہ ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی۔۔۔مجھے اس میں وہ عذرا دکھائی نہیں دی جس سے میں پیار کرتا تھا، جو میری زندگی کی ہم سفر بننے والی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

عذرا باس کے پاس دو دفعہ گئی لیکن مجھ سے ابھی دور رہنا ہی مناسب سمجھا، شاید اس لئے کہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ سکے اور شاید اسی لئے وہ میرے سیکشن کو چھوڑ کر باس کے پرسنل سیکشن میں چلی گئی۔اب ہمارا ملنا لگ بھگ ناممکن سا لگ رہا تھا۔وہ اب کینٹین میں نظر نہ آتی تھی۔وہ کب آتی تھی کب جاتی تھی، مجھے کچھ پتا نہ ہوتا تھا۔اسے دفتر جانے کے لئے کارپوریشن کی گاڑی فراہم تھی۔

ایک دن اچانک ہماری ملاقات ہوگئی، میں نے اسے کافی پینے کی دعوت دی۔وہ خاموشی کے ساتھ کینٹین کی جانب چلنے لگی۔ہم دونوں کافی پی رہے تھے لیکن

خاموش تھے۔ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، میں اس کی آنکھوں میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا اور شاید وہ میری آنکھوں میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔

''عذرا۔۔۔ کچھ تو بولو۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔ میرے دل کی حالت۔۔؟''

''میں سب جانتی ہوں۔۔ مجھے احساس ہے لیکن میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔۔''

''کیسا فیصلہ۔۔؟ ہم ایک دوسرے کے ہونے کا فیصلہ تو کب کر چکے ہیں۔۔''

میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔ میں تمہیں بے حد چاہتا ہوں عذرا۔۔

''اور میں بھی تم سے بے حد۔۔۔!''

''محبت کرتی ہو نا۔۔؟ تو آؤ اس محبت کو ابدی بنا دیتے ہیں۔۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ وہ کافی کا آخری گھونٹ پینے کے بعد بغیر کچھ کہے چلی گئی۔

مجھے اپنی منتشر سوچوں کو سمیٹنے کے لئے عذرا کی ضرورت تھی اور عذرا۔۔۔!

وہ خاموش تھی اس نے اپنے لب سی لئے تھے۔

لمحے گزرتے گئے، بھاگتے گئے لیکن ایک لمحہ میرے لئے رک گیا، ذرا سا ٹھہر گیا اور میرے لئے وہ لمحہ۔۔۔۔ نہیں نہیں میں اس لمحے کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس لمحے نے میری زندگی کے ان گنت لمحوں کو اپنی سوچوں اور سانسوں میں قید کر لیا ہے۔ اس قید خانے کے دروازے کھلے ہیں، کھڑکیاں کھلی ہیں لیکن میں تنہائی کی اس قید سے باہر نہیں آنا چاہتا۔۔۔

عذرا نے اپنی بڑی بہن کے بچوں کی خاطر ہماری محبت کو دفن کر کے اپنے بہنوئی کے ساتھ شادی کر لی۔۔۔ اور میں سوچتا ہوں۔۔۔۔

یہ وفا ہے یا بے وفائی۔۔۔۔!

تم سے اچھا کون ہے

گلفام ہاسپیٹل کا ویٹنگ روم مرد، خواتین اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب اپنی اپنی باری کا انتظار کرر ہے تھے، ان میں میں بھی شامل تھا اور میرا نام فہرست کے آخری حصے میں درج تھا۔ اب تک صرف چھے مریض ہی ڈاکٹری معائنہ اور مشورے سے فارغ ہو چکے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے یہاں جانے کتنی دیر رکنا پڑے گا میں نے ویٹنگ روم کے ایک گوشے میں اپنی کرسی سنبھال لی تھی۔ یہاں سے میں نہ صرف اندر کے حالات و واقعات سے واقف ہو رہا تھا بلکہ سامنے والی کھڑکی سے باہر کی جانب بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس پس منظر میں اندر باہر کا سب کچھ میری نظروں میں سمیٹ چکا تھا۔ باہر کے نظاروں کو جانے دیجیے اندر کی بات بتانا چاہوں گا۔ یہاں سب چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سب کی آنکھوں میں انتظار کی بے بسی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کی رونق غائب تھی۔ جو تیمادار تھے وہ بھی بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ہسپتالی نسخوں میں اپنی صحت تلاش کرر ہے تھے، کچھ اخبار پڑھ رہے تھے، کچھ لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں موبائل تھامے اپنے حال اور ماضی میں جھانک رہے تھے۔ میری سامنے والی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا، معصوم سا، پیارا سا بچہ تھا جس کی عمر شاید چند مہینوں سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خاتون شاید اس کی دادی یا نانی تھی۔ بچے کی ماں ڈاکٹری معائنہ کے لئے اندر جا چکی تھی۔ اس کا خاوند بھی ساتھ میں گیا تھا۔ دفعتاً بچہ جانے کیوں رونے لگا، معصوم معصوم سے انداز میں چلانے لگا۔ رونے کی وجہ سے ویٹنگ روم میں

قریب قریب سارے افراد۔۔۔مرد، خواتین اور بچے اس کی جانب دیکھنے لگے لیکن ان کا خاموش رہنا ہی وقت کی ضرورت تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب کھڑا ہوگیا۔ بچے کو چپ کرانے کی ہر ممکن کرنے لگا۔ میری بے بسی دیکھ کر ایک جوان خاتون ہمارے قریب آئی اور محبت بھرے لہجے میں بچے کو دلاسہ دینے لگی لیکن بچہ خاموش ہونے کے بجائے شدت سے رونے لگا۔

اور پھر یوں ہوا خاتون نے اپنے پرس میں سے اپنا موبائل نکالا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ اچانک اس کی انگلیاں تھم سی گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک انجانی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ موبائل میں کوئی تصویر نظر آرہی تھی۔ خاتون اب اپنا موبائل بچے کی نظروں کے قریب لا چکی تھی۔ اچانک رونے کی آواز بند ہوگئی اور اب بچے کے معصوم معصوم سے، ننھے ننھے سے ہونٹوں پر ایک بہت ہی خوبصورت مسکراہٹ آچکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک رمق سی ابھر چکی تھی۔۔۔ موبائل کے اسکرین پر اس کی ماں کی ہنستی مسکراتی تصویر نظر آرہی تھی۔

آخری سہارا

دفتری مصروفیات کی وجہ سے میرا بار بار گھر آنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہو گیا تھا لیکن جب دو ماہ بعد مجھے گھر آنے کا موقع ملتا تو دادی کو اپنی کار میں بٹھا کر لانگ ڈرائیونگ کے لئے لے جانا، کبھی شہر کے ایک جانب تو کبھی کسی باغیچے میں اور کبھی دریا کے کنارے۔اب کے بار جب میں گھر آیا تو دادی نے ڈل جھیل کی جانب جانے کی خواہش ظاہر کی۔۔

''ڈل جھیل ہی کیوں؟۔۔ ہمارا شہر تو دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔''

''میں نے ڈل جھیل کے کنارے اپنی زندگی کے انمول سال گزارے ہیں، ایک بار پھر مدتوں بعد ڈل جھیل کو اپنے سامنے دیکھ کر اپنی یادوں میں کھونا چاہتی ہوں، اپنی سوچوں کو آواز دینا چاہتی ہوں۔''

''دادی میں بھول گیا تھا کہ آپ کی یادیں ہی آپ کی زندگی کا اثاثہ ہیں۔ڈل جھیل کی جانب ہی چلتے ہیں۔مختلف راستے اپنا کر آپ کو ڈل جھیل کے آس پاس کی بستی کی بھی سیر کراوں گا۔''

میری کار سڑکوں پر بھاگتی رہی، اچانک دادی نے ایک جگہ کار روکنے کے لئے کہا۔۔

میں نے گھبرا کر کار روک دی۔

''کیا ہوا دادی آپ ٹھیک ہیں نا۔۔؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔وہ سامنے دیکھو۔۔ پہاڑی کے دامن میں دیکھو کیا

ہے۔۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں ایک خستہ مکان۔۔۔ بوسیدہ مکان۔۔۔نہ در ہے اور نہ دیوار۔۔۔اندر باہر سے ایک جیسا، یہاں کوئی نہیں رہتا۔ جانے کس کی جائیداد ہے زندہ بھی ہے۔۔؟"

"مجھے یاد آرہا ہے"۔ دادی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔

"کیا یاد آرہا ہے؟ ماضی کی کوئی بات۔۔؟"

"ہاں مجھے یاد آرہا ہے یہ مکان ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ہوٹل اپنے نام اور کام سے کافی معروف تھا۔ ہوٹل کا نام یاد نہیں آرہا ہے لیکن ہوٹل کا ناک نقشہ میری نظروں سے دور نہیں۔"

"جو آپ کو یاد آرہا ہے وہ تو بتا دیجیے۔۔"

"اس ہوٹل میں ایک غیر مسلم کا قتل ہوا تھا۔ ہوٹل کے ایک ویٹر کا قتل۔"

"تو پھر۔۔؟"

"اس خبر نے پورے شہر کو ہلا کے رکھ دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شہر گاوں سے آکر ہوٹل کے آنگن میں جمع ہو گئے، دل و جان سے ناحق خون پر ماتم کرنے لگے۔ ایک معصوم کی جان کی خاطر بے تحاشا آنسو بہانے لگے حالانکہ نی تو مقتول کو جانتے تھے اور نہ ہی قاتل کو۔۔ان کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہ تھا، روٹی روزی کی خاطر یہاں آئے تھے۔ لوگوں کا جذبہ الفت ایک انجانے کے لئے کس قدر قابل تعریف وتحسین تھا، میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب پورے شہر میں اندھیروں نے روشنیوں کو ہٹانا شروع کیا تو انتظامیہ نے حرکت میں آکر قاتل کو گرفتار لیا۔ معصوم ویٹر کو ہوٹل ہی کے دوسرے ویٹر نے روپیہ پیسے کی لالچ میں قتل کیا تھا۔ کچھ کچھ ایسا ہی مجھ یاد آرہا ہے۔"

''دادی یہ تو بہت پرانی بات ہوگی۔۔اس مکان کو میں بھی کئی برسوں سے اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔''

''ہاں بہت پرانی بات ہے جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کی بات ہے۔اب تو میں بھی اسی سال کی دہلیز پار کرچکی ہوں۔''

''اب چلتے ہیں۔۔ایسی سوچیں آپ کو پریشان کرتی رہیں گی۔۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کار اسٹارٹ کرلی اور اپنی سوچوں میں کھو گیا۔ ہاں میری سوچیں۔۔ تب بھی ایک قتل ہوا تھا ایک معصوم کا قتل۔۔۔اور اب تو روز ہی ایسا ہوتا ہے، روز ہی خون بہتا ہے، روز ہی انسان مرتا ہے اور انسانیت کا خون بہتا ہے لیکن تب مرنے اور مارنے والے کی پہچان ہوتی تھی، اب وہی پہچان بے پہچانی میں بدل گئی ہے۔''

پہچان اور بے پہچانی کے درمیان اس قدر طویل فاصلہ۔۔۔یہ فاصلہ کب طے ہوگا، کیسے ہوگا نہ تو میں جانتا ہوں اور نہ ہی میری دادی۔۔

''کار روک لو۔۔دادی کی آواز سن کر میں ان سوچوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔''

''کیا ہوا دادی۔۔؟'' میں نے کار کو روکتے ہوئے کہا۔۔

''ڈل جھیل کو دیکھ رہے ہونا۔۔؟''

''ہاں دیکھ تو رہا ہوں سامنے ہی تو ہے۔''

''ڈل کو یہ کیا ہوگیا ہے۔؟ بے جان ڈل۔۔۔بے رنگ پانی ۔۔مرجھائے ہوئے کنول کے پھول۔۔۔کوئی خوشبو نہیں۔۔سفید سفید پانی کا وہ سندر سندر سا نیلا پن کہاں گیا۔۔؟''

''اب آپ کو کیسے بتاؤں، کیسے سمجھاؤں زندگی کی یہ نئی کہانی۔۔گھر چلتے ہیں دادی۔۔''

''نہیں ابھی نہیں۔۔۔مجھے دیکھنے دو۔۔۔وہ ڈل جھیل۔۔۔وہ سندر سندر سی جھیل

جس کو میں نے دیکھا تھا۔۔۔سوتے جاگتے دیکھا تھا۔۔کہاں ہے وہ جھیل نادر۔۔؟ کیا میری جھیل مسمار ہوگئی ہوٹل کی طرح۔۔ بسے بسائے گھر کی طرح جانے اس ہوٹل میں کتنے کمرے تھے اور ان کمروں میں کتنے گھر آباد تھے۔۔کہاں گئے وہ گھر اور ان گھروں کے مکین۔۔۔نادر یہ تو بتا دو میرا گھر کہاں ہے۔؟ میرا کمرہ کہاں ہے؟، میرا آنگن کہاں ہے؟، میرا کشمیر کہاں ہے۔؟"

"دادی یہ ماحول آپ کی سوچوں کو بھی بے رنگ کردے گا، مسمار کردے گا۔۔آپ کی سوچیں، آپ کی یادیں آپ کی ڈھلتی عمر کا سہارا ہیں۔۔۔زندگی کا آخری سہارا۔۔یہ آخری سہارا چھیننا نہیں چاہیے۔۔۔میں اب گھر کی طرف جارہا ہوں۔۔"

دادی نے خاموشی کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ذہن کے گوشوں میں پوسیدہ سوچوں اور اپنی بے خواب آنکھوں میں جانے کیا تلاش کرنے لگی۔۔!

میرے لہو کی کہانی

بے ترتیب لفظوں کی دیوار جانے کب سے میرے سامنے کھڑی ہے لیکن اب آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے انداز میں ان لفظوں کی بے ترتیبی میں ترتیب سی آنے لگی ہے اور میں لفظوں میں پوشیدہ بے شمار چہرے دیکھ رہا ہوں۔ بہت سارے چہرے ایسے ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے اس لئے ان کی پہچان میرے لئے ناممکن ہے۔ ایسے بھی بہت سارے چہرے ہیں جنہیں میں دیکھ چکا ہوں لیکن میرے ذہن کے گوشوں میں روپوش ہو چکے ہیں اور اب ان کی پہچان ممکن نہیں۔ دیوار پر لفظوں کے روپ میں کچھ ایسے بھی چہرے ہیں جو میرے قریب رہے ہیں یا میں ان کے قریب رہا ہوں۔ ان میں دادا دادی کے چہرے نظر آرہے ہیں۔۔۔ اپنے پورے حسن و جمال کی پاکیزگی کے ساتھ ایک چہرہ میری اماں کا ہے، خلوص اور محبت سے بھرا بھرا چہرہ، میرے والد کی تصویر میں ان کی سادگی، شرافت اور نفاست صاف جھلک رہی ہے۔۔ میرا کوئی اور ہے ہی نہیں، نہ بھائی نہ بہن۔۔۔ میں ان کی شفقتوں اور محبتوں سے محروم ہوں۔ میرا اگر کوئی اور اپنا ہوتا تو شاید لفظوں کی صورت میں ان کے چہرے میرے سامنے رہتے اور پھر جنہیں میں نہیں جانتا یا جن کو میں نے نہیں دیکھا ان کے تعلق سے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ان کی کہانیوں کو قبرستان کی مٹی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے اور مٹی ان کے چہروں کو لفظوں کا روپ نہیں دے سکتی۔ اب تو ان کی کہانیاں زندگی کی داستانیں ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ ہاں قبرستان کی خاموشیوں میں ایک آواز سنائی دیتی ہے اور وہ میری آواز ہے لیکن میں اس قبرستان کا

مکین نہیں ہوں، میں تو اپنے مکان، اپنے گھر میں رہتا ہوں۔ یہ بڑا بڑا سا کھلا کھلا سا مکان میرے دادا دادی کے وقت میں تعمیر ہوا تھا۔ان کی وفات کے بعد میرے والدین کی مملکت کا حصہ بنا، میرے والدین بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اس لئے ان کے بعد یہ مکان، یہ گھر اس کے ساتھ دو ایکڑ اراضی اور بارہ مرلے پر پھیلا ہوا خاندانی قبرستان۔۔۔۔۔اب سب کچھ میرا ہے۔اس قبرستان میں ان گنت قبریں اپنی داستان کو سمیٹ ماضی کا حصہ بن چکی ہیں، قبرستان کی اداس اداس فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہیں لیکن جن کو میں جانتا ہوں جو میرے قریب رہ رہے ہیں ان کی کہی ان کہی تو میری سوچوں میں محفوظ ہیں، میری یادوں کا حصہ ہیں۔ان کے قدموں کی آہٹ اب بھی میرے گھر کے آنگن میں سنائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود میں اکیلا ہوں، تنہا ہوں۔کبھی یہ تنہائی مجھے اچھی لگتی تھی، پیاری لگتی تھی لیکن اب اس تنہائی اس اکیلے پن سے میں ڈرنے لگا ہوں، مجھے خوف سا محسوس ہوتا ہے، لرز سا جاتا ہوں۔۔گھر کے اتنے سارے کمرے۔۔خالی خالی سے، اتنی لمبی چوڑی زمین بنجر بنجر سی۔۔۔قبرستان کی بے حس خاموشی۔۔شادی اس سے نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی تک کوئی من پسند خوابوں اور خیالوں سے سجی سنوری لڑکی ملی نہیں اور پھر۔۔۔میرا کیریئر، میرا مستقبل میرے لئے اہمیت کا حامل ہے۔۔

ایک عجیب اتفاق ہوا، ایک شام میں نشاط باغ جانے والی شاہراہ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک ایک کار تیز رفتاری کے عالم میں چنار کے درخت سے ٹکرا گئی۔ میں کار کی جانب دوڑا اور راہ گیروں کی مدد سے ایک بزرگ خاتون اور ایک لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوا۔ان کو ہاسپٹل لے گیا، ان کی دیکھ بھال کی، ان کو ان کے ہوٹل چھوڑ آیا اور قریب قریب ہر صبح و شام ان سے ملنا میرا معمول بن گیا۔وہ تھے ہندوستانی اور ان کا تعلق اجمیر سے تھا لیکن اب کافی عرصے سے کینیڈا میں مقیم

تھے۔ سیر وتفریح کے لئے کشمیر آئے تھے، یہ حادثہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا اور میں اپنی تنہائیاں بانٹنے میں کامیاب ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح عالیہ کے روپ میں ایک رسیلا بدن، مہکتا ہوا سراپا میری زندگی میں آیا۔

میں نے عالیہ کے ساتھ کینڈا جانے کا فیصلہ کر لیا جہاں وہ اپنے والد کا بزنس بڑی خوبی کے ساتھ سنبھال رہی تھی لیکن جب میرے کینڈا جانے کی بات میرے دروازے کے باہر آئی تو تو میری جائیداد خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار میرے گھر کے سامنے نظر آنے لگی۔ من ہی من میں یہ سوچ کر کہ میرے گھر، زمین، جائیداد کو کون سنبھالے گا، میرے خاندانی قبرستان کی رکھوالی کون کرے گا اس پس منظر میں اپنی جائیداد فروخت کرنے کا من بنا لیا۔۔۔

قبرستان کے گیٹ پر ایک بڑا سا مضبوط تالا چڑھا کر میں نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا۔ قبرستان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نئے مکان مالک نے لے لی۔ میں نے ان کے ساتھ قبرستان کو بہتر حالت میں رکھنے کے تعلق سے وضاحت کے ساتھ بات کی اور ان کی باتوں سے مطمئن ہر کر گیٹ کی چابی ان کے حوالے کر دی۔ میں اس لئے بھی ان کی باتوں سے مطمئن ہوا کہ ان کی باتیں مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کی گفتگو میں نیک جذبہ اور احترام بھی نظر آ رہا تھا۔

کینڈا جا کر میں بزنس میں بے حد مصروف ہو گیا۔ عالیہ کی ذمہ داریاں میرے کندھے پر آ گئیں۔ میں نے اس بزنس کو اپنے طریقہ کار سے وسعت دی اور روپیہ پیسہ کمانا میری زندگی کا مقصد بن گیا۔

اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ رات کافی بیت چکی تھی اور میں اچانک گھبرائے ہوئے نیند سے جاگ اٹھا۔ عالیہ میرے قریب ہی سو رہی تھی، نیند میں ڈوبی ہوئی۔۔ اچانک میری نظریں ہماری خواب گاہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئیں۔

مجھے لگا جیسے دیوار پر میرے شمار بے ترتیب الفاظ بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان بے ترتیب الفاظ نے ترتیب پاتے پاتے انسانی چہروں کے بجائے قبرستان کے قبروں کی صورت اختیار کی اور مجھے لگا جیسے ان قبروں کی تہہ سے بہت ساری آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی تھیں۔۔ڈر اور خوف کی آوازیں۔۔انسانی قدموں سے ابھرنے والی آوازیں۔۔۔میں واقعی ڈر سا گیا اور میں نے ساری کہانی عالیہ کو سنا دی۔۔

"عالیہ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا قبرستان مجھے بلا رہا ہے۔ مجھے جانا چاہیے"۔۔

عالیہ نے ڈرتے ڈرتے اجازت دی۔

چار برس بعد میں اپنے وطن کو اپنے قدموں کی آواز سے اپنی آمد کی اطلاع دے رہا تھا، خوش ہو رہا تھا اور اداس بھی۔۔۔جب خوشی اور اداسی ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں تو ان دیکھی ان جانی تڑپ کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ یہ احساس لے کر جب میں اپنی بستی سے گزرنے لگا تو حیرانی ہوئی اور پریشانی بھی کہ میرے جانے پہچانے لوگ مجھے نظر انداز کر رہے تھے، خاموشی سے میرے سامنے گزر رہے تھے۔ قبرستان کی جانب اپنے تھکے تھکے اور رکے رکے قدم بڑھائے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی شناخت، اپنی پہچان اور اپنی خاندانی وراثت سے محروم ہو چکا تھا۔

میرے لہو کی کہانی بے ترتیب ہو کر ہمیشہ کے لئے قبرستان کی تہہ میں اتر چکی تھی وہاں قبرستان تھا اور نہ ہی قبریں۔۔۔

ان کی جگہ آٹھ منزلہ شاپنگ مال میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔!

❁❁❁

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ نور شاہ کون ہے؟ تو میں جواباً کہوں گا کہ وہ دلیر جو سنِ رسیدگی میں بھی افسانہ بن رہا ہے، وہ فنکار جو پرانی کتاب کی نئی کہانی ترتیب دے رہا ہے، جو آواز کا جادو جگا کر درِ دل لکھ رہا ہے، جو ماں کو تلاش کر کے نئی نسل کو سبق دے رہا ہے، جو کہانی کا المیہ لکھ رہا ہے، جو گھر گھر پانی پہنچانے کا خواب دیکھ رہا ہے، جو معروف ہو کر بھی سوال کر رہا ہے میں کون ہوں؟، جو ماضی کی تلاش کر رہا ہے، جو سیاست سے دور، ان کہی کو پہچان دے کر کارنیک کر رہا ہے، جو ڈوب گئے ہم ساحل پر کو اپنا اپنا مقدر تسلیم کر رہا ہے، جو سوداگر اور رشوت کے خلاف ہے اور بدلے موسم کے رنگ کو قلم سے نیا رنگ دے رہا ہے، جو میرے لہو کی کہانی لکھ کر اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہے وہ بڑا فنکار نور شاہ ہے۔ نور شاہ کے اسلوب اور کہانی کی بنت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی ناقدین اس پر خامہ فرسائی کریں گے، میں صرف اتنا کہوں گا کہ نور شاہ ایک افسانہ ہے جو کل مزے سے پڑھا جاتا تھا، آج اس کے چرچے ہیں اور کل اس کی دھوم ہوگی۔ ایک کہانی ہے جو پچھلے ساٹھ سال سے دہرائی جا رہی ہے اور ابد تک دہرائی جائے گی۔

میرے لہو کی کہانی میں جو متنوع افسانے اور افسانچے شامل ہیں ان میں معاشرے کا عکس اور قرب و جوار کی پرچھائیوں کو کہانی کا رنگ دیا گیا ہے اور یہ رنگ اتنا گہرا اور اثر آفریں ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ماند نہیں پڑے گا بلکہ اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوگا ایسا مجھے یقین ہے۔

ایس معشوق احمد

₹300/-

ISBN 978-81-19234-71-4

9 788119 234714

MEEZAN PUBLISHERS
OPPOSITE FIRE SERVICES HEAD QUATERS,
BATAMALOO, SRINAGAR-190009, KASHMIR.
CELL: 9419002212, 8494002212, 7006773403
meezanpublishers@gmail.com

MEEZAN